تہذیبوں کا تصادم

شاہنواز فاروقی

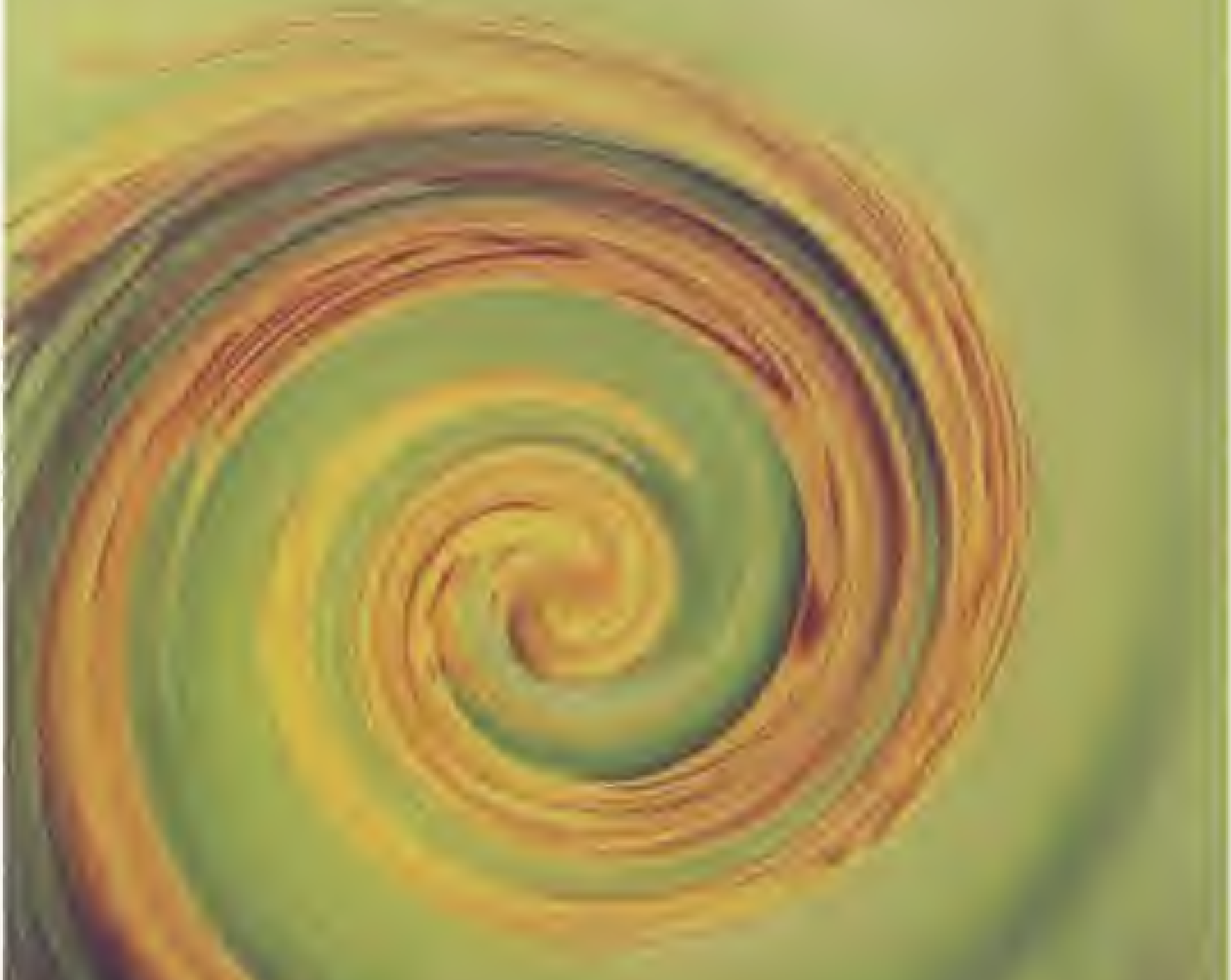

عقیدہ اور تہذیب

تہذیبوں کے تصادم میں عقیدے اور تہذیب کے باہمی تعلق کی بحث بنیادی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا رومؒ، امام غزالیؒ، اقبالؒ، مولانا مودودیؒ، رینے گینوں، محمد حسن عسکری، آنند کمار سوامی، سید حسین نصر اور سلیم احمد کے خیالات پیش کیے جاسکتے ہیں مگر اس میں مشکل یہ ہے کہ پھر گفتگو اصطلاحی اور تکنیکی ہو جائے گی اور بہت سے قارئین کے لیے تفہیم کا مسئلہ پیدا ہوگا۔ ہم جن حالات سے دوچار ہیں، ان میں ابلاغ سے زیادہ اہم کچھ نہیں۔ مثل مشہور ہے ''جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا''۔ چنانچہ آپ سے اس مسئلے پر زیادہ سے زیادہ آسان لفظوں میں گفتگو کرتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ بیج اور درخت کے باہمی تعلق کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں۔ بس یہی عقیدے اور تہذیب کا باہمی رشتہ ہے۔ عقیدہ بیج ہے اور درخت اس کی تہذیب۔ پودا درخت کے بیج میں موجود رہتا ہے مگر اس کا اظہار ضروری ہے۔ بیج کے مقام پر کونپل پھوٹتی ہے اور اس کا اظہار شروع ہو جاتا ہے۔ اس میں بیج اجمال ہے اور درخت اس کی تفصیل۔ بیج وحدت ہے اور درخت اس کی کثرت۔ لیکن درخت میں کیا کچھ ہوتا ہے؟ درخت کی چار چیزیں تو سبھی پہچانتے ہیں: تنا، شاخیں، پتے اور پھل۔

ظاہر ہے کہ جیسا بیج ہوگا، ویسا ہی درخت ہوگا۔ آم کی گٹھلی سے آم کا درخت برآمد ہوگا۔ امرود کے بیج سے امرود کا پیڑ اور ٹماٹر کے بیج سے ٹماٹر کا پودا۔ چونکہ بیج مختلف ہے، اس لیے درخت کی ہر چیز مختلف ہوگی۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو درخت دراصل بیج کے امکانات کا دوسرا نام ہے۔ جاننے والے دیکھتے ہی پہچان جاتے ہیں کہ یہ کس چیز کا درخت ہے اور تمیز رکھنے والے دو درختوں کے درمیان آسانی سے امتیاز کر لیتے ہیں۔ تہذیبوں کے سلسلے میں تمیز کی یہ صلاحیت سب سے اہم ہے، ورنہ لوگ آم کا درخت دیکھیں گے اور ممکن ہے کہ ہم اسے امرود کا

درخت سمجھیں۔ تمیز کی یہ اہلیت تہذیبوں کے درمیان رد و قبول کو ممکن بناتی ہے۔ یعنی یہ اہلیت ہی ہمیں بتاتی ہے کہ ہم کس تہذیب سے کیا لیں اور کیا نہ لیں۔ تمیز کی اہلیت موجود نہ ہو یا کمزور ہو تو ہم ظاہری صورتوں سے دھوکا کھا سکتے ہیں۔ اب مثلاً دنیا میں آم کی سیکڑوں قسمیں ہیں۔ تمیز نہ ہو تو ہمیں معلوم ہی نہیں ہوگا کہ کون سا درخت چونسے کا ہے اور کون سا لنگڑے کا؟ چنانچہ عقیدے پر ایمان لانا ہی کافی نہیں، عقیدے اور اس کی تفصیل کا بھی کچھ نہ کچھ علم ہونا چاہیے۔

بلاشبہ بیج بنیاد ہے، اصل ہے، لیکن اس کا درخت بننا بھی ضروری ہے۔ ہم جانتے ہیں بعض بیج مٹی میں ہی گل سڑ کر رہ جاتے ہیں اور مٹی ہو جاتے ہیں۔ بعض زمینیں نوخیز نہیں ہوتیں۔ بسا اوقات بیج کو کھاد اور پانی صحیح مقدار میں فراہم نہیں ہو پاتا۔ کہیں روشنی اور ہوا کی کمی ہو جاتی ہے اور اس سے بیج کے بہت سے امکانات متاثر ہو جاتے ہیں۔ پودوں اور درختوں پر موسم بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ جاڑا فصلوں کی فصلیں اور باغات کے باغات کھا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ انہی لوگوں کو ہو سکتا ہے، جنہوں نے ٹھٹھرے ہوئے پودے دیکھے ہیں (بعض انسانوں کو دیکھ کر بھی یہی احساس ہوتا ہے کہ بیچارے ٹھٹھر گئے)۔ لو چلتی ہے اور تباہی مچا دیتی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ بعض پھل سخت سردی سے پکتے ہیں اور بعض سخت گرمی سے۔ معاف کیجیے! یہاں مولانا رومؒ کا ایک شعر سنانا ضروری ہو گیا۔

مصلحت در دینِ عیسیٰ غار و کوہ

مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ

یعنی حضرت عیسیٰؑ کے دین کی ''مصلحت'' ترکِ دنیا ہے، غار و کوہ ہیں اور حضورِ اکرمﷺ کے دین کی مصلحت جہاد اور شوکت کا اظہار ہے۔ مولانا کے اس شعر میں جنگ کا لفظ شعری ضرورت کے تحت آ گیا۔ آپ نے دیکھا ابھی ہم نے جو بات کہی مولانا نے اسے کس سطح پر جا کر بیان کیا۔ ان باتوں سے ظاہر ہو گیا کہ بیج کے امکانات کے اظہار کے لیے کیا کیا ضروری ہے۔

اب یہاں زمین کی جگہ انسان کو رکھ لیجیے۔ عقیدہ موجود ہے مگر اس کا اظہار نہیں ہو رہا۔ یا عقیدہ صرف عبادت میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسان کے اعمال، افعال، معاملات، علوم اور فنون سب

اس عقیدے کے اظہار سے محروم ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پھر شخصی اور اجتماعی سطح پر تہذیب کی صورت کیا ہو جائے گی؟ شعور نہیں کہ وہ جو کچھ برت رہے ہیں، اس میں سے ان کا کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ حالانکہ ایک وقت تھا کہ ان کا عقیدہ پوری تہذیب پیدا کر رہا تھا۔ فلسفہ، ادب، سائنس، ٹیکنالوجی، عمرانیات، معدنیات، نفسیات، مراسم، معاملات، آداب، لباس، تراش خراش، وضع قطع، جنگ، صلح، امن، غرض یہ کہ کیا تھا جو ایک دائرے میں نہیں تھا۔

حضرت عمر فاروقؓ کا قول ہے ''ہم تمھیں تمہارے افعال سے جانتے ہیں اور انسان اس کے سوا کر کیا سکتا ہے؟'' نیت کا حال تو صرف خدا کو معلوم ہوتا ہے۔ تہذیب کی اہمیت یہی ہے کہ یہی دنیا میں ہمارا تعارف ہوتی ہے۔ انسان فکر و عمل کے جو سانچے پیدا کرتا ہے، انہی سے دنیا اس کے اصل اصول کا اندازہ کرتی ہے۔

تہذیبی مظاہر پیدا کرنا مذاق نہیں۔ تعلق اور Public Relationing میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پیشہ وارانہ مسکراہٹ اور محبت آمیز مسکراہٹ میں لفظ مسکراہٹ کے سوا کچھ مشترک نہیں۔ اداکاروں کے آنسو اور حقیقی زندگی میں بہنے والے آنسو ایک نہیں ہوتے۔ ہماری تہذیب جس کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ لوگ نعت لکھتے ہیں اور اس میں بھی ''میں'' بولنے لگتا ہے۔ ایسی بیمار شخصیتوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو اپنی گمراہی پر قرآن و حدیث کے حوالے چسپاں کر دیتے ہیں اور اس سے ان کی مراد معاذ اللہ یہ ہوتی ہے کہ انھوں نے جو بکواس کی، خدا اور اس کے رسول ﷺ کا منشا بھی وہی ہے۔ قیامت یہ ہے کہ ایسے لوگ خود کو مذہبی آدمی یا مذہبی اسکالر بھی سمجھتے ہیں۔

عقیدہ عمل کی بنیاد ہے، بجائے خود عمل نہیں ہے۔ بلاشبہ عقیدہ ناقص ہوگا تو عمل بھی ناقص ہو گا لیکن جب عمل ظاہر ہو جاتا ہے اور مظہر بن جاتا ہے تو پھر اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ وہی زندگی بسر کرنے کا ''وسیلہ'' بن جاتا ہے۔ اس سے ہمارا تشخص متعین ہوتا ہے۔ تہذیب کی اہمیت یہی ہے۔

اس گفتگو کا ہماری اجتماعی زندگی سے یہ تعلق ہے کہ مغرب اولین صورت میں چاہتا یہ ہے کہ مسلمان اپنے عقائد پر بے شک کاربند رہیں مگر تہذیبی مظاہر اس کے چلتے رہیں۔ اسے معلوم ہے

کہ دوسرے مرحلے پر یہ ہوگا کہ مظاہر کا تجربہ ہمارے عقائد پر بھی اثر ڈالے گا اور وہ اپنی اصل صورت میں اصل روح کے ساتھ باقی نہیں رہیں گے اور معاف کیجیے گا مغرب نے بے شک ابھی تک ہمارے عقائد نہیں بدلے مگر عقائد سے ہمارے تعلق کو اتنا بدل دیا ہے کہ اس کا اندازہ بھی اچھے اچھوں کو نہیں ہے۔ کیا یہ معمولی بات ہے؟ اور کیا اس صورتِ حال کا مقابلہ اس کے سوا ممکن ہے کہ ہم اپنے عقیدے ہی پر نہیں اس سے برآمد ہونے والی تہذیب پر بھی اصرار کریں اور مسلمانوں میں اس خلاقانہ تہذیبی روح کو بیدار کریں جو اپنی دنیا آپ پیدا کرسکتی ہو۔ اقبال نے کبھی شکایت کی تھی:

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

اور اب تو ہمارے یہاں کتاب پڑھنے والے بھی ''پانڈے'' کی طرح کمیاب ہوتے جارہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس گفتگو کی کوئی الٰہیات یا Ontology بھی ہے؟ بالکل ہے حدیثِ قدسی کا مفہوم ہے:

''میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں، چنانچہ میں نے کائنات کو پیدا کیا''۔

صاف ظاہر ہے کہ یہ کائنات بجائے خود ایک تہذیب ہے۔ اب اس حدیثِ قدسی سے برآمد ہونے والا میر کا معرکہ آراء شعر پڑھ لیجیے:

محبت نے کاڑھا ہے ظلمت سے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

وما علینا الا البلاغ

تہذیبوں کا تصادم کلیات کی سطح پر

تہذیبوں کے تصادم کو بعض لوگ دھوتی، شلوار اور پتلون کی سطح پر دیکھتے اور بیان کرتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ قائداعظم نے تو دوقومی نظریے کو گائے اور لوٹے کی سطح پر بیان کیا ہے اور بالکل ٹھیک کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندو گائے کو پوجتے ہیں اور ہم گائے کو کھاتے ہیں۔ ہندوؤں کے لوٹے میں ٹینٹو نہیں ہوتا، ہمارے لوٹے میں ٹینٹو ہوتا ہے۔ لیکن تہذیبوں کے امتیازات بہر حال اس سطح پر متعین نہیں ہوتے، یہ کام کلیات یا بنیادی تصورات کے حوالے سے وضع ہونے والے سانچوں کی سطح پر بیان ہوتے ہیں۔ آپ اس سطح پر چیزوں کو سمجھ لیں گے تو خواہ آپ کے سامنے مینڈک ٹرّائے یا شیر اور ہاتھی آ جائے، آپ کا فہم زائل نہیں ہوگا اور کوئی کنفیوژن اور ابہام پیدا نہیں ہوگا۔ اسلام ہمیں اصول کی شناخت سکھاتا ہے، بتوں کی پوجا نہیں۔ اسلامی تہذیب میں بتوں کا کیا کام؟ بہر حال آئیے اس حوالے سے صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں۔

اسلامی تہذیب ہو یا جدید مغربی تہذیب، ہندو تہذیب ہو یا عیسائی تہذیب، چار تصورات ایسے ہیں جنھیں کوئی تہذیب نظر انداز کر کے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ پہلا تصور الٰہیات ہے۔

۱۔ الٰہیات جس کے علم کو انگریزی میں Ontology کہتے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کا کوئی آدمی یا کوئی تہذیب ''الٰہ'' کے تصور سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ خدا کو مانتے ہیں، وہ بھی ایک عقیدہ رکھتے ہیں اور جو لوگ خدا کو نہیں مانتے، ان کا یہ خدا کو نہ ماننا بھی ایک ''عقیدہ'' ہے۔ ایک الٰہیات ہے، ایک Ontological اصول ہے۔ مثال کے طور پر مسلمان ایک خدا کے قائل ہیں۔ عیسائیت میں ایک خدا کے ساتھ تثلیث کا تصور بھی ہے۔ جدید مغربی تہذیب کا خدا ''مادہ'' ہے۔ اس اعتبار سے خالصتاً علمی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کا

Ontological اصول ماورائیت یا Super Naturalism پر مبنی ہے، جبکہ جدید مغربی تہذیب کا الہیاتی اصول Naturalism یا فطرت پرستی ہے۔ اب آپ ان اصولوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر دیکھیے۔ کیا ان میں کوئی مطابقت ممکن ہے؟ کیا ان کے درمیان کوئی پُل بنایا جاسکتا ہے؟ کچھ لوگ نیند میں بسا اوقات میلوں کا سفر طے کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں۔ وہ اس اصول کے دائرے میں تہذیبوں کے تصادم کا منکر بھی ہو سکتے ہیں، وہ اسلامی تہذیب اور جدید مغربی تہذیب کو رشتۂ ازدواج میں بھی منسلک کر سکتے ہیں اور ان کے درمیان پُرامن بقائے باہمی بھی ایجاد کر سکتے ہیں۔ لیکن کیا ایسا کرنا درست ہوگا؟ اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں پوری اسلامی تہذیب کی تاریخ ازسرِنو لکھنی ہوگی۔ اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ سمیت ایسے لاکھوں دانش وروں اور علماء کو ''ڈی بریف'' کرنا ہوگا۔ حیرت ہے کہ بیچارے علامہ اقبال نے ہزاروں مقامات پر جدید مغرب، جدید مغربی تہذیب، تہذیبِ حاضر جیسی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ بیچارے اقبال، انھیں آخری وقت تک معلوم نہ ہو سکا کہ تہذیبیں تو کبھی لڑتی ہی نہیں۔ وہ تو سر نیہوڑائے بیٹھی رہتی ہیں۔ تصادم یا تو ایک بدتہذیبی اور دوسری بدتہذیبی میں ہوتا ہے، یا تہذیب اور وحشت میں۔

اور مفکرِ اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی فکر کا کیا کریں؟

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

تنقیحات، تفہیمات، مسئلۂ قومیت، پردہ، ضبطِ ولادت، اسلامی تہذیب کے اصول ومبادی، غرضیکہ مولانا کی جو کتاب اٹھائیے، اس میں جدید مغربی تہذیب، مغربی تہذیب کی اصطلاح برآمد ہو جاتی ہے تو مولانا مودودیؒ کو بھی معلوم نہیں تھا کہ جدید مغربی تہذیب کے لیے تہذیب کی اصطلاح ہی استعمال نہیں ہونی چاہیے۔

۲۔ خیر آئیے کلیات کی سطح پر تہذیبوں کی شناخت کے دوسرے اصول کا جائزہ لیں۔ دنیا کی کوئی تہذیب ہو وہ یقینی اور حتمی علم کا کوئی نہ کوئی شعور ضرور رکھتی ہے۔ یہ تصور صحیح، غلط، ناقص، کامل

سب کچھ ہوسکتا ہے مگر ہوتا ضرور ہے۔ اسے تہذیب کا تصورِ علم یا Epistimological اصول کہتے ہیں۔ اس اصول کے دائرے کا بنیادی سوال یہ ہے کہ یقینی علم کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اسلامی تہذیب کا جواب ہے ''وحی''۔ جدید مغربی تہذیب کا جواب ہے ''سائنس''۔ کیا یہ چھوٹا سا فرق ہے؟ یاد رہے کہ دونوں تہذیبیں صرف اصول بیان کر کے نہیں رہ جاتیں، وہ اس اصول کا اطلاق ایک دوسرے پر بھی کرتی ہیں اور اس سے ایک دوسرے کی تنقید ہی نہیں تنقیص بھی برآمد ہوتی ہے۔ جدید تہذیب کہتی ہے: تجربے اور مشاہدے کے باہر جو کچھ ہے، خواب و خیال اور افسانہ و افسوں ہے۔ اسلامی تہذیب کہتی ہے کہ جو کچھ نظر نہیں آتا وہی ''اصل'' ہے۔

بعض لوگ اس کے باوجود اسلامی تہذیب اور جدید مغربی تہذیب کو روح افزا اور نورس بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ لیکن یہ آبِ حیات اور زہر کا فرق ہے۔ البتہ Sleep walkers کی بات اور ہے۔ وہ تو نیند میں کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ بہر حال کلیات کی سطح پر تصورِ علم کے فرق سے کیا کیا امتیازات پیدا ہوتے ہیں، ان کے بیان کے لیے کم از کم دس ہزار صفحات پر مشتمل کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ لیکن آج تو ہم صرف دو کلیات پر بات کر سکے۔ مزید پر کل گفتگو ہوگی۔

تہذیبوں کا تصادم۔۔۔کلیات کی سطح پر

(دوسری اور آخری قسط)

۳۔ دنیا کی کوئی تہذیب بھی ''سببِ مؤثر'' یا Efficient Cause کے اصول کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ آسان زبان میں اس اصول کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی (اور کائنات) کیسے وجود میں آئی؟ یہاں اسلامی تہذیب ہمیں اس دائمی تعلیم سے آراستہ کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کُن کہا اور کائنات تخلیق ہوگئی اور آدم کو اس نے خود بنایا اور آدم ارادۂ الٰہی میں بھی آدم ہی تھے اور عملاً بھی پہلے دن سے آدم تھے۔ اس کے جواب میں جدید مغربی تہذیب ڈاروِن کے تصورِ ارتقاء کو لا کھڑا کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں بنیادی تصورات میں کیسے مطابقت پیدا کی جائے اور ان کے مابین پُر امن بقائے باہمی کے لیے کس جادوگر سے رابطہ کیا جائے۔ کیونکہ ویسے تو یہ تصورات قیامت تک ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ چونکہ اب تک بیچاری اُمتِ مسلمہ اپنے تصورِ تخلیق پر اصرار ہی نہیں کر رہی، اس لیے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی یا خوش فہمی لاحق ہے کہ یہ پُر امن بقائے باہمی کی صورت ہے۔ بقول اقبال:

ملاّ کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

۴۔ دنیا میں جتنی تہذیبوں کی شہادتیں دستیاب ہیں، ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس نے اس سوال کو نظر انداز کیا ہو کہ بالآخر انسان کی ساری تگ و دو کا حاصل کیا ہے؟ یعنی زندگی کی کامیابی یا ناکامی کا حتمی پیمانہ کسے کہا جائے؟ یہاں اسلامی تہذیب ہمیں ''نجات'' کا تصور دیتی ہے۔ جدید مغربی تہذیب اس کے مقابلے پر ترقی یا Progress کا تصور لا کھڑا کرتی ہے۔ اس اصول کو اصطلاح میں حتمی سبب یا Final Cause کہتے ہیں۔ اب بعض لوگ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اسلام مادی ترقی کے خلاف نہیں۔ ٹھیک ہے، مگر وہ اسے پیمانہ بھی نہیں بناتا۔

یہاں تہذیبوں کے تجزیے اور ان کے تقابل کے سب سے بڑے عصری ماہر آرنلڈ ٹوائن بی کا تبصرہ بھی سن لیجیے، فرماتے ہیں:

''تکنیکی ترقی اور اخلاقی زوال میں ایک ارتباطِ باہمی پایا جاتا ہے۔ جب کوئی تہذیب تکنیکی اعتبار سے ترقی کرتی ہے تو اس میں اخلاقی زوال درآتا ہے''۔

اس لیے ٹوائن بی نے صاف کہا ہے کہ جدید مغربی تہذیب کو تباہی سے بچانے کی دو ہی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اس میں کسی نہ کسی طرح کی روحانیت داخل کی جائے اور دوسرے یہ کہ یہ تہذیب ٹیکنالوجی کے عشق سے جان چھڑائے۔ اقبال کو بھی یہاں یاد کرلیا جائے تو کیا برا ہے:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

بہرحال یہاں کہنے کی اصل بات یہ ہے کہ ہم نے اتوار اور آج کے کالم میں تہذیبوں کے جن چار کلمات کا ذکر کیا ہے، انھیں پیشِ نظر رکھا جائے تو خواہ سامنے کوئی آ کھڑا ہو اور خواہ وہ کچھ بھی کہے، آپ کنفیوژ نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ جہاں اصلِ اصول سامنے ہو، وہاں کسی بھی فرد کی رائے کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔

ہمارے یہاں ایک عجیب فیشن ہے، کسی شاعر یا ادیب کو ادب کا نوبل انعام ملتا ہے تو یار لوگ اُس کا ذکر اس طرح شروع کردیتے ہیں جیسے وہ اسے بچپن سے جانتے ہیں، خواہ انھوں نے انعام ملنے سے قبل کبھی اُس کا نام بھی نہ سنا ہو۔ اسی طرح جب سے بیچارے ہن ٹنگٹن کے تہذیبوں کے تصادم کا شور ہوا ہے، لوگ اس پر بات کررہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جیسے وہ خود ہیں ویسے ہی دوسرے بھی ہوں گے۔ الحمدللہ! اس فیشن میں ہم کبھی مبتلا نہیں رہے۔ ہمارے کالموں کا مجموعہ ''کاغذ کے سپاہی'' شائع ہو چکا ہے اور اس کے تمام کالم ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۱ء کے جسارت سے لیے گئے ہیں اور یہ زمانہ ہن ٹنگٹن کے ظہور سے تین چار سال پہلے کا ہے۔ لیکن خیر سے ان تمام کالموں میں تہذیبوں کا تصادم برپا ہے کیونکہ یہ سارے ہی کالم مغرب کی تنقید سے عبارت

ہیں۔ اللہ کا احسان ہے کہ ہمیں نہ جدید مغربی تہذیب کے حوالے سے کبھی کوئی خوش فہمی لاحق رہی ہے نہ غلط فہمی۔ ہمیں نہ جدید مغربی تہذیب سے کوئی نئی شکایت پیدا ہوئی ہے نہ کسی نئی اُمید نے اس کے حوالے سے ہمیں متوجہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اصولوں کی تفہیم دے دیتا ہے تو انسان حادثوں اور سانحوں کے ذریعے سیکھنے کی ذلت سے محفوظ رہتا ہے۔ کئی برس پہلے کا ایک شعر ہے:

کم نگاہی کی طرف دار بنی رہتی ہیں
خواہشیں آنکھ میں دیوار بنی رہتی ہیں

تہذیب کی اہمیت۔۔۔ایک تاریخی تناظر

تہذیبوں کے تصادم میں تہذیب کی اہمیت کی بحث کوئی مجرد گفتگو نہیں ہے۔ اس کا ایک تاریخی تناظر بھی ہے۔

انسانی فکر کی تاریخ میں مجرد تصورات اور نظریات کی کوئی کمی نہیں۔ مغربی فلسفہ یونانی مفکرین کا رہینِ منت ہے اور یونانی فلاسفہ میں افلاطون کی اہمیت ایسی ہے کہ مغرب کے ایک بڑے جدید فلسفی وائٹ ہیڈ نے پورے فلسفے کے بارے میں کہا ہے کہ وہ افلاطون کی فکر کے حاشیے یا Foot Note کے سوا کچھ نہیں۔ اس تجزیے میں بعض لوگوں کو افراط نظر آتی ہے۔ یعنی انھیں لگتا ہے کہ وائٹ ہیڈ نے افلاطون کی اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے۔ بالفرض ایسا ہی ہے تو بھی افلاطون کی مرکزیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اب افلاطون کی فکر کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے یہاں ایک مثالی ریاست کا خاکہ ''جمہوریہ'' یا Republic کی صورت میں موجود ہے۔ محض خاکے کے اعتبار سے دیکھا جائے تو جمہوریہ کا خاکہ غیر معمولی ہے جیسا کہ افلاطون کی بلند فکری سطح کے مطابق اس کو ہونا چاہیے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ جمہوریہ کا خاکہ محض خاکہ ہی رہ گیا، کبھی تجربہ نہ بن سکا۔ چنانچہ جمہوریہ کا خاکہ تاریخ کے سفر میں ایک ''فکری ممی'' بن کر رہ گیا اور اب اس پر گفتگو اسی اعتبار سے ہوتی ہے۔

سر تھامس مور کی Utopia بھی ایک مثالی ریاست کے خاکے پر مشتمل تھی، لیکن مثالی ریاست کا خاکہ تاریخ میں ایک طنز بھی بن کر رہ گیا۔ مغربی دنیا میں ان تصورات پر خواہ علمی بحثیں کتنی ہی کیوں نہ ہوئی ہوں لیکن انھیں جدید مغربی ریاست یا جدید مغربی تہذیب کے لیے کوئی خطرہ نہیں سمجھا گیا، حالانکہ کم از کم افلاطون کی جمہوریہ میں ایسے عناصر موجود ہیں کہ اگر اس کا تجربہ حقیقت بن جائے تو جدید مغربی ریاست کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج پیدا ہو جائے گا۔

حافظے کی کمزوری سے ہم بھول جاتے ہیں کہ مارکس نے اپنا سارا فکری کام برطانیہ میں کیا۔

مارکس کی پیش گوئی یہ تھی کہ کمیونسٹ انقلاب کے لیے سب سے زیادہ سازگار حالات برطانیہ میں ہیں، مگر اس کی پیش گوئی غلط ثابت ہوئی، انقلاب برطانیہ کے بجائے روس میں آ گیا اور جیسے ہی روس میں انقلاب آیا، مارکسزم جدید مغربی تہذیب کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن گیا۔ حالانکہ مولانا مودودیؒ نے بالکل درست کہا ہے کہ مارکسزم جدید مغربی تہذیب ہی کا ایک شاخسانہ ہے۔ لیکن اس شاخسانے نے چونکہ تاریخ اور ملکیت کا ایک جداگانہ تصور پیدا کر لیا تھا اور یہ شاخسانہ محض فلسفہ، محض مجرد فکر نہیں رہ گیا تھا چنانچہ پوری مغربی تہذیب اس کے خوف میں مبتلا ہوگئی۔ مارکسزم کو لینن فراہم نہ ہوتا تو شاید مارکسزم بھی جمہوریہ اور یوٹوپیا کی طرح تاریخ کے میوزیم میں رکھ دیا جاتا۔ لیکن ایک خیال تجربہ بن چکا تھا اور مغربی تہذیب کے دائرے ہی میں ایک نیا تہذیبی تجربہ خلق کر رہا تھا۔ اگرچہ جدید سرمایہ دارانہ تہذیب اور مارکسزم کی الٰہیات (Ontology) اور علمیات یا Epistimology میں کوئی فرق نہیں تھا، یہاں تک کہ ان کا تصورِ انسان، تصورِ تخلیق (Efficient Cause) اور زندگی کی حتمی قدر یا Final Cause کا تصور بھی ایک تھا لیکن اس کے باوجود مارکسزم کی بنیاد پر برپا ہونے والے انقلاب نے مغرب کی نفسیات کو سرمایہ دارانہ نفسیات کہہ کر مسترد کر دیا اور پرولتاریوں کے نقطۂ نظر سے ایک نیا نفسیاتی علم پیدا کیا۔ انھوں نے اپنی تہذیب اور اس کے شاخسانے میں بھی تصادم برپا کیا اور اس تصادم نے اتنا بڑا تاریخی تجربہ پیدا کیا کہ سوویت یونین کے خاتمے اور مارکسزم کی تحلیل نے فوکویاما جیسے امریکی دانش وروں کو یہ کہنے پر مائل کیا کہ یہاں پہنچ کر اب تاریخ کا سفر ہی تمام ہوگیا۔ یہ رائے درست نہیں تھی اور فوکویاما نے بعدازاں اپنی اس رائے سے بڑی حد تک رجوع کر لیا لیکن اس کے اوّلین تبصرے سے اس امر کا اندازہ تو کیا ہی جا سکتا ہے کہ جدید مغربی تہذیب کے پروردہ ذہن نے مارکسزم کو کتنی بڑی حقیقت سمجھا۔

اب ذرا دنیا میں موجود دوسرے نظام ہائے خیال پر ایک نگاہ ڈالیے۔ ہندوازم ایک پورا تصورِ حیات ہے اور یہ تصورِ حیات جمہوریہ اور یوٹوپیا بھی نہیں۔ اس نے اپنی ایک غیر معمولی تہذیب پیدا کر کے دکھائی۔ لیکن جدید تہذیب کا اس سے کوئی تصادم نہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔

ہندو تہذیب نے مغربی تہذیب کی بالادستی عملاً قبول کر لی ہے اور اس نے اپنے اساسی اور بنیادی تصورات اور ان کی بنیاد پر اپنے تہذیبی تجربے کو آگے بڑھانے پر اصرار ترک کر دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں مغرب نے ہندو تہذیب کے مختلف سانچوں اور تصورات کو قبول کرنے اور آگے بڑھانے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ ہندو ازم کی مجرد روحانیت مغرب میں آج بھی مقبول ہے۔ ساری مغربی دنیا میں یوگا سیکھا اور سکھایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یوگا ہندو تہذیب کا ایک معمولی سا جزو ہے اور یہ جزو بھی اپنے کُل سے الگ ہو کر بے چہرہ ہو گیا ہے۔ حالانکہ ہندو ازم میں یوگا کا تصور اپنی اصل میں ایک روحانی تصور ہے اور سمجھنے کے لیے اسے تصوف کے ''تصورِ سلوک'' کی طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔

بدھ ازم اور چین کے تاؤ ازم اور کنفیوشزم کی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ یہ اپنی اپنی جگہ بڑی تہذیبیں ہیں مگر اب مجموعی اعتبار سے یہ سب مُردہ تہذیبیں ہیں۔ ان کے کچھ رسوم و رواج اور طور طریقے ضرور باقی ہیں اور ان سے بعض لوگوں کو گمان ہوتا ہے کہ یہ زندہ نظام ہائے خیال ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ سب بحیثیتِ مجموعی ''ممیائے'' جا چکے ہیں۔ چنانچہ مغرب انھیں بھی اپنے لیے خطرہ نہیں سمجھتا اور انھیں ہر سطح پر پچکارتا رہتا ہے۔

اب ذرا آپ اسلام کے دائرے میں موجود مختلف روایتوں کے بارے میں مغربی دنیا کے طرزِ عمل پر غور کیجیے۔ مغرب کو ''صوفی ازم'' بہت بھاتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اصل اسلام تو یہی ہے۔ اور جب اہلِ مغرب یہ کہتے ہیں تو وہ شریعت اور طریقت یا شریعت اور تصوف کو الگ کر لیتے ہیں۔ یہ بجائے خود ایک سازش ہے، اس لیے کہ شریعت اور طریقت لازم و ملزوم ہیں۔ یعنی مغرب سمجھتا ہے کہ اگر وہ ان دونوں کو الگ کر لے اور صرف طریقت کو اصل اسلام باور کرائے، اسے فروغ دے تو اسلام کے دائرے میں صرف مجرد روحانیت باقی رہ جائے گی اور اسلام ایک ہمہ گیر تہذیبی تجربہ نہیں رہے گا۔

اسی طرح آپ دیکھ رہے ہیں کہ بعض تحریکیں جنہوں نے خود کو روزے، نماز کے تصور تک محدود کیا ہوا ہے، ان کے بارے میں بھی مغرب کا رویہ معاندانہ نہیں ہے، لیکن ذرا کل کوئی کہہ کر

دیکھیے کہ اسلامی تصوف میں شریعت اور طریقت الگ نہیں اور طریقت ہر حال میں شریعت کی پابند ہے اور یہ کہ روزے، نماز کا تصور اسلام کی کلّیت سے مربوط ہے۔ آپ یہ کہیں گے اور دیکھیں گے کہ مغرب تصوف اور روزے نماز والی تحریکوں کے بھی ویسا ہی خلاف ہے جیسا کہ وہ خودساختہ ''سیاسی اسلام'' کے خلاف ہے۔ اور یہ صرف تصوف اور روزے نماز والوں کا معاملہ نہیں، ہندوازم کل سے اپنی کلّیت پر غلط یا صحیح اصرار کرنے لگے، جدید مغربی تہذیب اس کی بھی دشمن ہو جائے گی۔ اس لیے کہ کلّیت پر اصرار سے مکمل تہذیبی تجربہ پیدا ہوگا اور مغربی تہذیب اور اس کے مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے۔ جو تہذیب مجرد عقائد، مجرد اصولوں اور مجرد تصورات لیے بیٹھی ہے، وہ جدید مغربی تہذیب کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ سوویت یونین ختم ہو گیا، مارکسزم تحلیل ہو گیا اور اس تجارت میں امریکا کو سالانہ ۲۰۰ ارب ڈالر کے خسارے کا سامنا ہے مگر مغرب خوش ہے، مطمئن ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ بالآخر امریکا اور چین کے درمیان تصادم ہوگا، ممکن ہے۔ مگر یہ تہذیبوں کا نہیں ''مفادات کا تصادم'' ہوگا، لیکن اسلامی تہذیب کے ساتھ جدید مغربی تہذیب کا تصادم الف سے ے تک ہے۔ یہ تصادم امام غزالیؒ کے زمانے میں بھی الف سے ے تک تھا۔ صلیبی جنگوں کے وقت بھی الف سے ے تک تھا۔ نوآبادیاتی دور میں بھی الف سے ے تک تھا۔ آج بھی الف سے ے تک ہے اور کل بھی الف سے ے تک ہوگا۔ اکبر الہ آبادی اور اقبال کی شاعری ہمیں سو سال سے اور مولانا مودودیؒ کی نثر ہمیں پچاس سال سے یہی بتا رہی ہے۔ یہ اتنی سامنے کی بات ہے کہ جس نے ہمیں اس کی اطلاع نہیں دی، اس کا یا تو علم ناقص ہے یا اس کے تناظر میں ٹیڑھ ہے، یا پھر اس کی نیت میں کھوٹ ہے۔ ویسے مسلم دنیا میں تثلیث کے فرزندوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔

تہذیبوں کے تصادم کا نیا مرحلہ

مغربی دنیا میں توہینِ رسالتؐ کی شرم ناک واردات کے ساتھ ہی تہذیبوں کا تصادم بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ اب یہ تصادم مسلم دنیا کے بعض اندھوں کو بھی نظر آنے لگا ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ مسلم دنیا کے بعض حکمرانوں نے بھی اس کی مذمت فرمائی ہے۔

۱۱ ستمبر سے اب تک کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو اسلام اور مسلمانوں سے اہلِ مغرب کی نفرت میں ایک برق رفتار "ارتقاء" نظر آ رہا ہے۔ ۱۱ ستمبر کی رات مغرب میں ملا عمر اور اسامہ بن لادن نشانے پر تھے، اب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی براہِ راست ان کی نفرت کی زد میں ہے۔ ۱۱ ستمبر کی رات بات مسلم بنیاد پرستوں تک محدود تھی، اب تمام مسلمان انھیں بنیاد پرست نظر آ رہے ہیں۔ ۱۱ ستمبر کی رات اہلِ مغرب کا مسئلہ صرف "مسلح جدوجہد" کرنے والے تھے، مگر اب اہلِ مغرب کو اسکارف بھی ایک ہتھیار نظر آ رہا ہے۔ چند ماہ قبل مسلمانوں کو جو رکاکت صرف ڈنمارک کے ایک اخبار میں نظر آ رہی تھی، وہ محض ایک دن میں پورے یورپ میں پھیل گئی۔ آپ چاہیں تو اسے رکاکت کی عالمگیریت کا نام دے سکتے ہیں۔

۱۱ ستمبر کے بعد مسلمانوں میں ایک بڑا طبقہ ایسا سامنے آیا جس نے کہا کہ ۱۱ ستمبر کے ذمہ دار فلاں فلاں ہیں۔ فلاں فلاں نہ ہوتے تو امریکا اور اس کے مغربی اتحادیوں کو کیا پڑی تھی کہ وہ افغانستان پر حملہ آور ہوتے؟ عراق کے خلاف بلاجواز اور ننگی جارحیت نے ایسے لوگوں کا کچھ نہ کچھ علاج کر دیا اور انھیں معلوم ہو گیا کہ مغربی دنیا کی اسلام اور مسلمان دشمنی کبھی کسی بن لادن یا ملا عمر کی محتاج نہیں رہی۔

توریت اور انجیل میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی پیش گوئیاں موجود تھیں۔ یہودی اور عیسائی کہا کرتے تھے کہ اگر نبی آخر الزماں کا ظہور ان کے زمانے میں ہوگا تو وہ آپؐ پر ایمان لے آئیں گے اور آپؐ کا ساتھ دیں گے۔ لیکن حضورِ اکرمؐ کا ظہور ہوا تو کافروں اور

مشرکوں کے ساتھ ساتھ یہودی اور عیسائی بھی آپؐ کے دشمن ہو گئے۔ چنانچہ قرآن نے ان پر سوال قائم کیا اور کہا کہ تم تو نبیؐ کی بعثت سے پہلے یہ کہا کرتے تھے۔

مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو صلیبی جنگوں کی تاریخ نہیں معلوم۔ ان جنگوں کی ابتدا نہ مسلمانوں نے کی تھی اور نہ اس کی وجہ کوئی اسامہ بن لادن یا ملا عمر تھا۔ سن ۱۰۹۵ء میں اس وقت کا کوئی جارج بش، ٹونی بلیئر یا ڈنمارک کا اخبار نہیں، بجائے خود پوپ اربن دوئم کلیسا کے منبر پر کھڑا ہوا اور اس نے کوئی لفظ چبائے بغیر کہا کہ اسلام ایک شیطانی مذہب اور اس کے ماننے والے ایک شیطانی مذہب کے ماننے والے ہیں اور ہمارا مقدس فرض ہے کہ ہم اس شیطانی مذہب اور اس کے پیروکاروں کو روئے زمین سے نابود کر دیں۔ اس کے بعد اس نے پورے یورپ کو ایک پرچم تلے جمع ہونے اور مسلمانوں کے خلاف ''کروسیڈ'' کی ابتدا کرنے کی دعوت دی اور تمام یورپی اقوام صرف تین سال میں ایک پرچم کے نیچے جمع ہوئیں اور ان صلیبی جنگوں کی ابتدا ہوئی جو کم و بیش دو سو سال جاری رہیں۔

خود رحمی اور خود مذمتی کے مرض میں مبتلا بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے ۱۱ ستمبر کو امریکا کی تجارتی اور دفاعی علامتوں کو نشانہ بنایا۔ ایسا نہ ہوتا تو مغرب ہم پر کیوں چڑھ دوڑتا، ایسے لوگوں کی لاعلمی اور کم فہمی افسوس ناک اور شرمناک ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا بہادر شاہ ظفر نے لندن پر حملہ کرایا تھا جو انگریز پورے برصغیر پر چڑھ دوڑے؟ کیا الجزائر کے مسلمانوں نے پیرس کو تہہ و بالا کر دیا تھا جو فرانس الجزائر پر قابض ہو گیا؟ کیا مسلمانوں نے جرمنی، ہالینڈ، پرتگال اور اٹلی کے خلاف دہشت گردی کی کوئی واردات کی تھی کہ وہ پورے مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ پر قابض ہو گئے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ چنانچہ ۱۱ ستمبر تو محض ایک بہانہ تھا، لندن کے بم دھماکے محض ایک پردہ تھے۔ اہلِ مغرب کا شعور اپنی نہاد میں اتنا مجرمانہ ہے کہ وہ اپنی کسی حرکت کے لیے کسی جواز کا محتاج نہیں۔

اسلام اور مسلمانوں پر مغرب صدیوں سے ایک تہذیبی یلغار کیے ہوئے ہے اور ہم اس کے ایک نئے مرحلے میں سانس لے رہے ہیں۔ اسلام پہلے مشرقِ وسطیٰ تک محدود حقیقت تھا، پھر وہ

ایشیا اور افریقہ میں بھی طاقتور بن گیا۔ چنانچہ اہلِ مغرب کی جارحیت کا دائرہ صلیبی جنگوں سے زیادہ وسیع ہو گیا۔ آج اسلام ایک عالمگیر حقیقت ہے اور مسلمان دنیا کی واحد عالمگیر اُمت۔ چنانچہ اہلِ مغرب کے اہداف بھی عالمگیر ہو گئے ہیں اور اہلِ مغرب اب مسلمانوں سے بڑھ کر ان کے ایمان اور طاقت کے سرچشموں پر حملوں کی جانب راغب ہیں۔

مغربی دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی تحقیر کی سیکڑوں صورتیں گزشتہ برسوں میں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ اہلِ مغرب نے اسلام میں عورتوں کے مقام کو لاکھوں بار تحقیر کا ہدف بنایا ہو گا۔ عرب شیخوں کے طرح طرح کے کارٹون اب مغرب کے حافظے کا مستقل حصہ ہیں۔ اسلام کے مختلف قوانین مغرب کے کس ملک کے ذرائع ابلاغ میں زیرِ بحث نہیں آئے اور کہاں ان کا مضحکہ نہیں اڑایا گیا، لیکن مسلمان ان تمام حملوں پر خاموش ہی رہے ہیں لیکن اب مغربی دنیا کی توجہ ہمارے سرچشموں پر مرکوز ہوئی ہے۔ ۱۱ ستمبر کے بعد سے اب تک مغرب کے درجنوں اخبارات وجرائد میں یہ رکیک اور شیطانی تجویز کھلم کھلا پیش کی جا چکی ہے کہ اگر ہمیں اسلام اور مسلمانوں سے حتمی طور پر نمٹنا ہے تو امریکا اور اس کے اتحادیوں کو چاہیے کہ وہ معاذ اللہ مکہ اور مدینے پر ایٹم بم گرا دیں۔ بعض مسلمان اسے غیر سنجیدہ بات سمجھتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کے کارٹونوں کی اشاعت ایک نفسیاتی ایٹم بم سے کم نہیں، اور یہ سلسلہ یہاں رکنے والا نہیں۔ امریکا کے ممتاز دانشور نوم چومسکی امریکا کو بدمعاش ریاست کہتے ہیں مگر بات اب بدمعاش مغرب تک آ پہنچی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ یہ بات نہیں مانیں گے۔

تہذیبوں کا تصادم اور تہذیب و بدتہذیبی کا معاملہ

برصغیر کی ملّتِ اسلامیہ نے اقبال، مولانا مودودی اور محمد حسن عسکری سے قطعِ نظر مغربی فکر پر جو کام کیا ہے، بیشتر صورتوں میں اس کی نوعیت ''چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ'' سے زیادہ نہیں۔ اور اب تو اس سلسلے میں مینڈکیوں کو بھی زکام ہونے لگا ہے۔ ویسے یہاں اقبال، مولانا مودودی اور عسکری صاحب کے کام کی بات بھی اضافی ہے، اس لیے کہ کتنے لوگوں نے انھیں پڑھنے کی طرح پڑھا ہے۔ تقریری مقابلہ جیتنے کے لیے اقبال کے دس شعر یاد کر لینا اور مولانا مودودی کی ۵۰ کتابیں خرید کر شیلف میں رکھ لینا اور بات ہے اور ان کی فکر کو اپنی روح اور اپنے شعور کا حصہ بنانا اور بات۔ رہے عسکری صاحب، تو ان کے شاگردوں میں ایک طرف ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی ہیں تو دوسری طرف انتظار حسین اور تیسری طرف سلیم احمد۔ مگر ان کی کلیت یا Totality کو سمجھنا آج بھی دشوار ہے کہ صرف سلیم احمد کو ان پر ایک کتاب لکھنے کی ہمت ہوئی۔

یہی وجہ ہے کہ تہذیبوں کے تصادم پر گفتگو ہوتی ہے تو بعض لوگ پوری سنجیدگی اور اخلاصِ نیت سے اور بعض لوگ ''چہ پدی چہ پدی کا شوربہ'' کا محاورہ یاد کرانے کے لیے سوال کرتے ہیں کہ کیا مغربی تہذیب کو بھی تہذیب کہا جائے جبکہ یہ ''باطلِ محض'' ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ انھیں یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ اسلامی تہذیب ایک درست اصطلاح ہے لیکن یہ بات ان کو قابلِ فہم نہیں لگتی کہ باطل پر کھڑے ہوئے ایک بندوبست کو تہذیب کہا جائے۔ اس سے بعض لوگ یہ بحث بھی نکال لیتے ہیں کہ اسلام اور مغرب کا تصادم دراصل تہذیب اور بدتہذیبی کا تصادم ہے، تہذیبوں کا تصادم نہیں۔ اگرچہ ایک غیر ضروری اور اضافی بحث ہے لیکن مبادیات کا صحیح فہم نہ ہونے سے اگر کوئی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے تو اسے دور کیا جانا چاہیے۔

ہمارے بڑے اور قدیم روایتی علماء کی تحریروں میں ایک جملہ اکثر پڑھنے کو ملتا ہے: ''شیطان خدا کی نقل کرتا ہے''۔ وہ کیسے کیسے نقل کرتا ہے، اس کی کچھ مثالیں بھی ہمارے علماء نے

پیش کی ہیں لیکن یہاں ان کے بیان کا موقع نہیں۔ شاید ہمارے علماء کے زیرِ اثر عیسائیت کے پرانے لٹریچر میں بھی یہ جملہ وضع ہوگیا:

"Satan is the ape of God."

لیکن اس بات کے کیا معنی ہیں؟ آیئے اسے کمیونزم اور جدید سرمایہ دارانہ فکر کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مارکسزم اپنی نہاد میں ایک مذہب دشمن فلسفہ تھا۔ مارکس نے مذہب کو عوام کی افیون قرار دیا ہے اور اس کی فکر میں نہ کہیں خدا ہے، نہ رسالت، وحی ہے نہ آخرت، عبادت ہے نہ مذہبی اخلاق کا کوئی تصور۔ یعنی مارکسزم مذہبی معنوں میں کسی عقیدے ہی کا قائل نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود مارکسزم نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے عقائد پیدا کر لیے۔

مارکسزم خود دین بن گیا۔ اس دین کا خدا کمیونسٹ ریاست تھی۔ مارکس خود پیغمبر تھا اور اس کی تصنیف ''داس کیپیٹال'' اس کی کتابِ مقدس تھی۔ اسی لیے اقبال نے اُس کے بارے میں کہا: نیست پیغمبر ولیکن دابغل دارد کتاب۔ یعنی وہ پیغمبر تو نہیں ہے مگر (پیغمبروں کی طرح) اس کے پاس ایک کتاب ہے۔ جدلیاتی مادیت کا تصور مارکسزم کا اساسی تصور تھا۔ اسے آپ مارکسزم کا اصولِ توحید سمجھیے کیونکہ اس سے پوری انسانی زندگی کی توجیہہ ہو جاتی تھی۔ کمیونسٹ انقلاب مارکسزم کا روزِ محشر تھا اور کمیونسٹ ریاست کی خدمت پر مارکسٹوں نے اتنا زور دیا کہ اس میں ''عبادت'' کا رنگ نظر آنے لگا۔ چنانچہ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ وہ مولانا عبیداللہ سندھی ہوں یا اقبال یا مولانا حسرت موہانی، انھوں نے اگر یہ کہا تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ مارکسزم میں اگر خدا کا تصور داخل کر دیا جائے تو وہ اسلام کے بہت قریب آ جاتا ہے۔ یہ تبصرہ سو فیصد غلط تھا لیکن یہ ہمارے بڑے لوگوں کا تبصرہ ہے اور اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو ایک مرحلے پر مارکسزم کے اس طرح ''جامع'' ہونے کا احساس ہوا جس طرح ہمیں اسلام کی جامعیت کا احساس ہوتا ہے۔

یہاں ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ کمیونزم کے ان ''عقائد'' کے زیرِ اثر کمیونسٹ

ریاست، سوشلسٹ معیشت، کمیونسٹ ادب، یہاں تک کہ مارکسسٹ نفسیات اور مارکسسٹ عمرانیات بھی نمودار ہوئیں۔ یعنی ایک خیال نے ''پوری تہذیب'' پیدا کر کے دکھا دی۔ سنجیدہ لوگوں کے لیے تو خیر اتنا کافی ہے البتہ چہ پدی چہ پدی کا شوربہ کے لیے عرض ہے کہ مارکسزم میں جنس یعنی Sex تک کا ایک الگ تصور تھا۔ مگر یہاں ہمیں بچوں کے اخلاق کا ہر قیمت پر تحفظ کرنا ہے، اس لیے بات کو ایک اور سمت میں آگے بڑھاتے ہیں مگر دو باتیں یاد دلاتے ہوئے۔ ایک یہ کہ مارکسزم کے اہم ترین نقادوں نے کہا کہ مارکسزم مذہب کے خلاف تھا لیکن وہ خود ایک مذہب بن گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے علماء نے فرمایا ہے کہ شیطان خدا کی نقل کرتا ہے۔ جدید سرمایہ دارانہ نظام کا معاملہ تو مارکسزم سے بھی زیادہ عیاں ہے۔ سرمایہ اس نظام کا خدا ہے۔ اس نظام کی وحی کا سرچشمہ صرف عقل ہے۔ آزادی کا تصور اس کی توحید ہے۔ جمہوریت اس توحید کا تنظیمی اور سیاسی وریاستی پہلو ہے۔ افادہ اس کی اخلاقیات ہے۔ مساوات اس کی سماجیات اور رواداری اس سماجیات کی منطق ہے۔ مگر یہ ان معاملات کو بیان کرنے کا صرف ایک طریقہ اور صرف ایک تناظر ہے، ورنہ جدید مغربی تہذیب میں انسان خود خدا بن کر کھڑا ہے اور اس کا کلمہ لا الہ الا انسان ہے۔ رہے اس تہذیب کے پیغمبر، تو وہ بہت ہیں مثلاً ڈیکارٹ، بیکن، ہیگل، لیوتھر، کانٹ، وٹگن اسٹائن، فوکو، دریدا۔

کیا یہاں یہ بھی یاد دلانا پڑے گا کہ مغرب میں صدیوں سے سرمایہ دارانہ معیشت، سرمایہ دارانہ ادب اور سرمایہ دارانہ آرٹ کی اصطلاحیں مروج ہیں۔ یہ پوری تہذیب نہیں تو اور کیا ہے؟ جن لوگوں کا علم اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ سے بھی زیادہ ہے، ان کی بات جدا ہے، ورنہ ہم یہ جانتے ہیں کہ اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ نے ہزاروں مقامات پر جدید مغرب کے لیے تہذیب ہی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ہم تہذیبوں کے تصادم کی اصطلاح انہی معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ عملی زندگی میں اصل چیز عقائد نہیں ان کا اظہار یعنی تہذیب ہے۔ یہ عالم شہادت ہے۔ یہاں دعویٰ نہیں اس کا ثبوت درکار ہوتا ہے۔

تہذیبوں کا تصادم یا مرغوں کی لڑائی؟

ہمارے یہاں اتنے مہذب اور اتنے عالم فاضل لوگ بھی پائے جاتے ہیں کہ وہ تہذیبوں کے تصادم کا ذکر بھی سنتے ہیں تو ان کے ذہنوں میں لڑتے ہوئے مرغوں کی تصویریں ابھرنے لگتی ہیں۔ برصغیر میں تو یوں بھی مرغ بازی ہمارے کلچر کا حصہ رہی ہے۔اس لیے تصویروں کی رنگارنگی بڑھ جاتی ہے۔ وہ لوگ تو اور بھی غضب ہیں جن کے ہاتھوں میں کسی وجہ سے قلم آ گیا ہے۔ وہ لفظوں کی حرمت کو کالموں کی کھونٹیوں پر ٹانگ کر لڑتے ہوئے مرغوں کی تصویریں قارئین کو بھی دکھانے لگتے ہیں۔ لیکن ان تصویروں کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ انھیں تہذیبوں کے تصادم کے بارے میں کیا مرغوں کی لڑائی کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں۔انھوں نے نہ مرغے پالے ہیں، نہ مرغ لڑائے ہیں، نہ مرغوں کی لڑائیوں کو دیکھا ہے۔بس کسی سے سن لیا اور پیٹ بھر لیا اور مرغ بازی کے نقاد۔مرزا یاس یگانہ چنگیزی نے کیا خوب کہا ہے:

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

اب ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں تہذیبوں کے تصادم سے کیا مرغوں کے تصادم سے بھی گہری دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ ہم اپنے کالموں میں بارہ چودہ سال سے تہذیبوں کی کشتی کرا رہے ہیں۔ ہم نے اس حقیر کام کی ابتدا اس وقت کی تھی، جب بیچارے سیموئل ہن ٹنگٹن کا نظریہ "Clash of the Civilization" بھی سامنے نہیں آیا تھا۔امریکی ٹیلنٹ کو پہچانتے نہیں ورنہ ہم بھی اُن کے کام آ سکتے تھے۔ خیر ہمارا جو نقصان ہونا تھا ہوا، لیکن بات یہ ہے کہ ہن ٹنگٹن صاحب نے کوئی نئی بات نہیں بتائی تھی۔ اسلامی تہذیب اور جدید مغربی تہذیب صدیوں سے تصادم کی حالت میں کھڑی تھی۔اس تصادم کو ایک ہزار فیصد ''علمی حالت'' میں دیکھنا ہو تو یہ منظر نامہ ملاحظہ کیجیے:

اسلامی تہذیب ''وحی'' کے تصور پر ایمان رکھتی ہے۔وحی سے ماوراء اور ماورائے فطرت کا

تصور بر آمد ہوتا ہے۔ ماوراء سے تخلیق کا تصور سامنے آتا ہے اور تخلیق سے نجات کا تصور جنم لیتا ہے۔

اس کے مقابل جدید مغربی تہذیب ہے جس میں وحی کی جگہ سائنس کھڑی ہے۔ ماورائے فطرت کے مقام پر صرف فطرت ہے۔ تخلیق کے خانے میں ڈارون کا ارتقاء اور نجات کے خانے میں ''ترقی'' بال کھولے سو رہی ہے۔

اس گفتگو کو مزید آسان کرنا ہو تو کہا جائے گا کہ ہر تہذیب میں یہ سوال بنیادی ہے کہ یقینی علم کا سرچشمہ کیا ہے۔ اسے اصطلاح میں تہذیب کی علمیاتی بنیاد یا Epistomology کہتے ہیں۔ اس حوالے سے اسلامی اور جدید مغربی تہذیب کے مابین سب سے بڑا تصادم یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کہتی ہے کہ یقینی علم کا سرچشمہ وحی ہے۔ جدید مغربی تہذیب کہتی ہے کہ وحی کا سائنسی تجزیہ اور مشاہدہ ممکن نہیں، اس لیے وحی کا تصور عقل کے لیے ناقابلِ قبول ہے، البتہ سائنس یہ کام کر سکتی ہے، اس لیے کہ وہ عقل سے ہم آہنگ ہے۔ تو مرغوں کی ایک لڑائی تو یہ ہوئی۔

علم سے وجود کی بحث نکلتی ہے۔ یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی بنانے والا بھی ہے یا نہیں، اور خود انسان اور کائنات مادی حقیقت ہیں یا مادی حقیقت سے اوپر بھی کوئی درجہ ہے۔ اسلامی تہذیب میں علمِ وحی بتاتا ہے کہ زندگی اور کائنات کا خالق ہے اور خالق بھی ایسا کہ کسی چیز سے اس کی مثال نہیں دی جاسکتی اور خود انسان اور کائنات بھی اپنی اصل میں روحانی حقیقت ہیں۔ اسے اصطلاح میں ماورائیت یا Super Naturalism کہا جاتا ہے اور یہ بحث علمِ وجود یا Ontology کے دائرے کی بحث ہے۔ جدید مغربی تہذیب Ontology کے دائرے میں Super Naturalism کے بجائے صرف Naturalism پر یقین رکھتی ہے اور اس سے آگے کسی حقیقت کو ماننے پر آمادہ نہیں۔ مرغوں کی دوسری لڑائی یہ ہوئی۔

تہذیبوں کے دائرے میں یہ سوال بھی بنیادی ہے کہ جو کچھ وجود میں آیا وہ کس طرح وجود میں آیا؟ خاص طور پر خود انسان۔ اسلامی تہذیب اس حوالے سے تخلیق کا تصور پیش کرتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے کُن کہا اور سب کچھ وجود میں آ گیا۔ آدم کی تخلیق بھی اسی اصول پر ہوئی۔ اصطلاح

میں اس بحث کو موثر سبب یا Efficient Cause کی بحث کہتے ہیں اور جدید مغربی تہذیب اس درجے میں تخلیق کے مقابلے میں ڈارون کے تصورِ ارتقاء کو رکھتی ہے۔ مرغوں کی ایک اور لڑائی یہ ہے۔

تہذیبوں کا ایک اور بنیادی سوال یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا حقیقی اور حتمی مقصد کیا ہے؟ یہ حتمی سبب یا Final Cause کے دائرے کی بحث ہے۔ اس بحث میں اسلامی تہذیب کا موقف یہ ہے کہ انسان کا حقیقی مقصد اور اس کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ وہ آخرت میں نجات حاصل کرلے۔ جدید مغربی تہذیب اس تصور کے مقابلے پر ترقی یا Progress کے تصور کو لاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ مرغوں کی چوتھی لڑائی یہاں ہو رہی ہے۔ اور یہ پینٹ شرٹ یا شلوار قمیص کی لڑائی نہیں ہے۔ یہاں بہت بڑے بڑے سوالات اور بہت بڑے بڑے جوابات ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں اور ان میں آپ اور میں کیا مولانا رومؒ اور امام غزالیؒ بھی مفاہمت کرانا چاہیں تو نہیں کرا سکتے، اور اگر کوئی شخص یہ کام کرنا چاہتا ہے تو وہ یا تو احمق ہے یا جاہل، پاگل ہے یا صریح معنوں میں مفاد پرست۔ اس لیے کہ صرف ان چار بنیادی امتیازات سے سیکڑوں دوسرے امتیازات پیدا ہوتے ہیں جو تہذیبوں اور ساخت کو یکسر تبدیل کر دیتے ہیں۔ ان تہذیبوں کے انسان ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کا ادب، شاعری، آرٹ، سائنس، ٹیکنالوجی، تعلقات، محبت، نفرت، جذبات، احساسات غرضیکہ سب کچھ ہی مختلف ہوتا ہے۔ اسے ہونا ہی چاہیے اور اگر ایسا نہیں ہے تو یا تو پھر اہلِ مغرب اسلامی ہو گئے ہیں یا ہم مغربی ہو گئے ہیں اور ہم اسلامی معاشروں میں بیٹھ کر اسلام کے نام پر مغربی تہذیب کا مقدمہ لڑ رہے ہیں۔ آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ایک بار پھر اچانک مرغے لڑانا شروع کر دیا ہے۔ کیا کریں صاحب بچپن کا شوق ہے، چور چوری سے جائے تو کیا ہیرا پھیری بھی چھوڑ دے؟

تہذیبوں کا تصادم اور مغربی دنیا کی ٹی بی

مغربی دنیا کی ٹی بی (ٹونی بلیئر اور بش) نے تہذیبوں کے صدیوں پرانے تصادم کو جس طرح عیاں کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انھوں نے الف سے انار اور بے سے بلی کہنے پر اکتفا نہیں کیا۔ انھوں نے انار اور بلی کی تصاویر بھی بنائیں اور ان میں رنگ بھی بھر دیے۔ ورنہ بعض لوگ تو بے چارے پوچھتے ہی رہ جاتے کہ انار کیسا ہوتا ہے اور اس کا رنگ کیسا ہوتا ہے۔ کہیں بلی بھیڑ کی طرح تو نہیں ہوتی۔ تہذیبی تصادم اور گلی ڈنڈے کے میچ میں کیا فرق ہوتا ہے؟ لیکن ٹی بی کے اتحاد نے کوئی ابہام پیدا نہیں ہونے دیا۔

ٹونی بلیئر نے اپنے حالیہ دورۂ امریکا میں دو اہم تقریریں کیں۔ خارجہ اُمور کے ایک انسٹی ٹیوٹ میں کی گئی ان کی تقریر تہذیبوں کے تصادم کے نئے مرحلے کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس تقریر میں ٹونی بلیئر نے صاف کہا کہ اصل مسئلہ اَقدار کے ٹکراؤ کا ہے۔ ان کے بقول ایک جانب اسلامی انتہا پسندوں کی رجعت پسندی، تارک خیالی اور خون آشامی ہے اور دوسری جانب مغرب کا تصور آزادی، جمہوریت، آزاد منڈی کی معیشت اور صحت مند مقابلے کی اَقدار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اصل جنگ تو خود مسلم دنیا میں برپا ہے جہاں تاریک خیال اور روشن ضمیر باہم دست و گریباں ہیں اور مسلم دنیا کو خود فیصلہ کرنا ہے کہ وہ ان میں کس کا انتخاب کرتی ہے۔ ٹونی بلیئر نے مغربی دنیا سے کہا کہ وہ عالمِ اسلام میں روشن خیالوں کی پشت پناہی کرے۔ یہ ٹونی بلیئر کا تبصرہ ہے۔ اب بش کا تازہ ترین تبصرہ بھی سن لیجیے، فرماتے ہیں کہ ہم اسلامی فاشسٹوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ انھوں نے اپنے اس زرّیں خیال کا اظہار برطانیہ میں طیاروں کی ممکنہ تباہی کے افسانے پر گفتگو کرتے ہوئے کیا۔

ٹیکساس کا کاؤبوائے ۱۱ رستمبر (9/11) کے بعد کروسیڈ کی اصطلاح استعمال کر کے آگے بڑھ گیا تھا لیکن اٹلی کے سابق وزیر اعظم سلویو برلسکونی نے اس کے فوراً بعد ہی مغربی اور اسلامی

تہذیب کا موازنہ کرڈالا۔ اس نے کہا: مغربی تہذیب اسلامی تہذیب سے برتر ہے اور اس نے جس طرح کمیونزم کو شکست دی ہے، اسی طرح اسلامی تہذیب کو بھی شکست سے دوچار کرے گی۔ مسلم دنیا کے افیونچی ابھی اپنے اپنے خوابناک عشرت کدوں میں پڑے اینٹھ ہی رہے تھے کہ جارج بش کے اٹارنی جنرل ایش کرافٹ نے واشنگٹن کی ایک پریس بریفنگ میں نعرہ لگا دیا۔ اس نے کہا کہ عیسائیت کا تصورِ خدا اسلام کے تصورِ خدا سے برتر اور فائق تر ہے کیونکہ اس کے بقول عیسائیت کے خدا نے انسانوں کی نجات کے لیے اپنے بیٹے حضرت عیسیٰؑ کی قربانی دے دی لیکن اسلام کا خدا اپنی عظمت کے اظہار کے لیے خود اپنے ماننے والوں سے جہاد کی صورت میں قربانی طلب کرتا ہے۔ یہ تینوں تبصرے تین ماہ کے عرصے میں یکے بعد دیگرے آئے اور اس کے فوراً بعد یورپ میں ناٹو کی افواج کے سابق کمانڈر جنرل کلارک نے تو بھانڈا ہی پھوڑ دیا۔ اس نے بی بی سی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں صاف کہا کہ ''اصل مسئلہ اسلام کی 'تعبیر' کا ہے اور طے یہ کرنا ہے کہ اسلام کی کون سی تعبیر درست ہے۔ یہ کہ اسلام ایک پُرامن مذہب ہے یا یہ کہ وہ ایسا مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں کو تشدد (یعنی جہاد) پر اُکساتا ہے''۔

اور اب ٹونی بلیئر کہہ رہا ہے کہ اصل مسئلہ تو اُقدار کا ہے۔ اس پر ایک مغربی مبصر نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ٹونی بلیئر ایک ایسے دور میں آزاد منڈی کی معیشت اور صحت مند مقابلے کی بات کر رہا ہے جس میں پوری دنیا کا دو تہائی سرمایہ صرف ۵۰۰ کارپوریشنوں کے ہاتھوں میں مرتکز ہو گیا ہے۔ اس بنیاد پر اس مبصر نے ٹونی بلیئر کو کارپوریٹ ورلڈ کا ترجمان قرار دیا ہے۔ لیکن ہمارے لیے اس بیان کی اصل اہمیت یہ نہیں ہے، کیونکہ ہمیں صدیوں سے معلوم ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام سے سرمایہ داری کے ایجنٹ برآمد نہیں ہوں گے تو کیا برآمد ہوں گے۔ چنانچہ ہمارے لیے اس بات کی اصل اہمیت یہ ہے کہ ٹونی بلیئر نے الفاظ نہیں چبائے اور ''ابہام'' پیدا کرنے کے بجائے واضح اصطلاحوں میں گفتگو کی۔ اصولی اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ اپنی دنیا میں اپنے موقف کا مقدمہ لڑ رہا ہے اور اس نے اب جا کر واضح اصطلاحوں کو استعمال کرنا شروع کیا ہے تو ایسا بلاسبب نہیں ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ دہشت گردی اور انتہا

پسندی کی اصطلاحوں سے آگے بڑھ جائے۔

جارج بش نے بھی گزشتہ پانچ برسوں میں پہلی بار اسلامی فاشزم اور اسلامی فاشسٹوں کی اصطلاح استعمال کی ہے، ورنہ اس سے پہلے وہ بھی انتہا پسند، بنیاد پرست اور ریڈیکل مسلمز کی اصطلاحوں کی جگالی کرتا رہا ہے۔ اس تبدیلی میں زور مسلم گروہوں کے بجائے اسلام پر بڑھتا ہوا صاف نظر آ رہا ہے۔

یہاں ہمیں سلیم احمد کی نظم ''مشرق ہار گیا'' ایک بار پھر یاد آ گئی۔ یہ نظم سلیم احمد نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جماعت اسلامی اور دائیں بازو کی جماعتوں کی شکست کے بعد لکھی تھی۔ آپ یہ نظم پڑھ چکے ہیں تو بھی اسے ایک اور مرتبہ پڑھنے میں فائدہ ہی فائدہ ہے:

کپلنگ نے کہا تھا
''مشرق، مشرق ہے
اور مغرب، مغرب ہے
اور دونوں کا ملنا ناممکن ہے''
لیکن مغرب، مشرق کے گھر آنگن میں آ پہنچا ہے
میرے بچوں کے کپڑے لندن سے آتے ہیں
میرا نوکر بی بی سی سے خبریں سنتا ہے
میں بیدلؔ اور حافظؔ کے بجائے
شیکسپیئر اور رِلکے کی باتیں کرتا ہوں
اخباروں میں
مغرب کے چکلوں کی خبریں اور تصویریں چھپتی ہیں
مجھ کو چگی داڑھی والے اکبر کی کھسیانی ہنسی پر
رحم آتا ہے
اقبال کی باتیں (گستاخی ہوتی ہے)

۔۔۔مجذوب کی بڑ ہیں
وارث شاہ اور بلھے شاہ اور بابا فرید؟
چلیے جانے دیجیے ان باتوں میں کیا رکھا ہے
مشرق ہار گیا ہے!
یہ بکسر اور پلاسی کی ہار نہیں ہے
ٹیپو اور جھانسی کی رانی کی ہار نہیں ہے
(سن ستاون کی جنگِ آزادی کی ہار نہیں ہے)
ایسی ہار تو جیتی جا سکتی ہے (شاید ہم نے جیت بھی لی ہے)
لیکن مشرق اپنی روح کے اندر ہار گیا ہے
قبلاں خاں تم ہار گئے ہو!
اور تمہارے ٹکڑوں پر پلنے والا لالچی مارکو پولو
جیت گیا ہے
اکبرِ اعظم! تم کو مغرب کی جس عیارہ نے تحفے بھیجے تھے
اور بڑا بھائی لکھا تھا
اس کے کتے بھی ان لوگوں سے افضل ہیں
جو تمھیں مہابلی اور ظلِ اللہ کہا کرتے تھے
مشرق کیا تھا؟
جسم سے اوپر اٹھنے کی اِک خواہش تھی
شہوت اور جبلت کی تاریکی میں
اک دیا جلانے کی کوشش تھی
میں سوچ رہا ہوں، سورج مشرق سے نکلا تھا
(مشرق سے جانے کتنے سورج نکلے تھے)

لیکن مغرب ہر سورج کو نگل گیا ہے
''میں ہار گیا ہوں''
میں نے اپنے گھر کی دیواروں پر لکھا ہے
''میں ہار گیا ہوں''
میں نے اپنے آئینے پر کالک مل دی ہے
اور تصویروں پر تھوکا ہے
ہارنے والے چہرے ایسے ہوتے ہیں
میری روح کے اندر اک ایسا گہرا زخم لگا ہے
جس کے بھرنے کے لیے صدیاں بھی ناکافی ہیں
میں اپنے بچے اور کتے دونوں کو ٹیپو کہتا ہوں
مجھ سے میرا سب کچھ لے لو
اور مجھے اک نفرت دے دو
مجھ سے میرا سب کچھ لے لو
اور مجھے اِک غصہ دے دو
ایسی نفرت، ایسا غصہ
جس کی آگ میں سب جل جائیں
۔۔۔میں بھی!!

سلیم احمد کی یہ نظم ۱۹۷۰ء میں لکھی گئی۔ مگر یہ نظم ۱۷۵۷ء اور ۱۸۵۷ء میں بھی لکھی جا سکتی تھی اور ۱۰۹۹ء میں بھی۔ یہ نظم ۲۰۰۱ء میں بھی تخلیق ہو سکتی تھی اور آج بھی تخلیق ہو سکتی ہے۔ گو معاملات اب اس نظم سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔

تہذیبوں کا تصادم اور حافظے کی کمزوری

تہذیبوں کے تصادم کا مسلمانوں کے حافظے کی کمزوری سے گہرا تعلق ہے۔ کتنے ہی مسلمان تاریخ کے سفر میں اونگھ جاتے ہیں اور کبھی سو جاتے ہیں۔ اچانک ان کی آنکھ کھلتی ہے۔ اطراف و اکناف پر نظر ڈالتے ہیں۔ پوچھتے ہیں، یہ کیا ہو رہا ہے؟ پھر خود ہی جواب دیتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تہذیبوں کا تصادم بہر حال برپا نہیں ہے۔ ہوتا تو سب سے پہلے اس کی اطلاع ہمیں ہوتی، لیکن تاریخ کا پورا کینوس ہمارے سامنے ہے۔

صلیبی جنگیں مسلمانوں کی ''ایجاد'' نہیں تھیں اور نہ ہی انھیں دو ملکوں کی جنگیں کہا جا سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان میں پورا عالم اسلام صلیبیوں کا ہدف نہیں تھا لیکن عالم اسلام کے اہم مراکز ان کی زد میں تھے۔ پھر ان جنگوں کا دورانیہ بھی دو سو سال پر محیط ہے اور یہ جنگیں اتنی اہم ہیں کہ مغرب کا ذہن آج سیکولر ہونے کے باوجود ان کے زیرِ اثر ہے۔ یورپ میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے حوالے سے کہا جا رہا ہے کہ اس بار مسلمان حملوں کے بغیر مغرب کو فتح کر لیں گے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ بعض مسلمانوں کے ذہن میں دو سو سال تک جاری رہنے والے تہذیبی تصادم کی کوئی یاد باقی نہیں۔ اس تصادم کی یاد جو مسلمانوں پر زبردستی تھوپا گیا تھا اور اس مغرب کی طرف سے تھوپا گیا تھا جو بہ زعم خود بڑا مذہبی اور بڑا مہذب تھا۔

خیر صلیبی جنگوں کا زمانہ تو ۱۰۹۵ء تا ۱۲۹۵ء تک ہے اور یہ کئی صدیوں پرانی بات ہے۔ اس کی یاد ہمارے اجتماعی حافظے سے محو ہو گئی ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمیں وہ تہذیبی تصادم بھی یاد نہیں جو اٹھارہویں صدی سے شروع ہوا اور جو انیسویں صدی کو نگل گیا اور جو بیسویں صدی کا نصف بھی نگل گیا۔ یہ تصادم بھی مسلمانوں نے شروع نہیں کیا تھا۔ یورپ کی وحشی اقوام تہذیب کا لبادہ اوڑھ کر اپنے جغرافیوں سے نکلیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سازشوں اور طاقت کے بہیمانہ استعمال کے ذریعے کم و بیش پورے عالم اسلام پر مسلط

ہوگئیں۔ان کا یہ تسلط دو چار سال نہیں، کم وبیش دوسو سال پر محیط ہوگیا۔اس تسلط کے دوران انھوں نے ہمارے مقاصد اور تہذیب کی ہر بنیاد کو کھودنے اور کھوکھلا کرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی رہیں۔حیرت ہے کہ بہت سے مسلمانوں کو دوسو سال کا یہ سیاسی، فوجی اور تہذیبی جبر بھی یاد نہیں جس کو مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے طبقے نے پوری جرأت کے ساتھ چیلنج کیا اور لاکھوں جانوں کے نذرانے پیش کیے۔اہم بات یہ ہے کہ اس تصادم کا دائرہ صلیبی جنگوں کی طرح ایک خطے تک محدود نہیں تھا بلکہ پوری مسلم دنیا اس کی رزم گاہ تھی۔اب صورت یہ بنی کہ دوسو سال کی صلیبی جنگیں اور دوسو سال کا نوآبادیاتی تسلط کل ملا کر چار سو سال ہو گئے مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ ۴۰۰ سال کا تہذیبی تصادم بھگتنے والے معصومیت سے سوال کرتے ہیں کہ تہذیبوں کا تصادم کہاں ہو رہا ہے؟

دوسری عالمی جنگ کے بعد کم وبیش پوری مسلم دنیا مغرب کی وحشی اور درندہ صفت اقوام کے چنگل سے نکل گئی مگر اس کے باوجود تہذیبوں کا تصادم جاری رہا۔مغربی استعمار مسلم دنیا میں مقامی ایجنٹ چھوڑ گئے اور خود لندن اور پیرس میں بیٹھ کر مسلم دنیا کو کنٹرول کرتے رہے۔یہ صورتِ حال ہنوز جاری ہے اور ۱۱ ستمبر کے بعد تہذیبوں کا تصادم نئی شدت اور وسعت کے ساتھ سامنے آیا۔تصادم کے ابتدائی مرحلے میں صرف مغربی جارحیت کی گئی مگر اس کے بعد تہذیبی و ثقافتی دہشت گردی بھی کی گئی اور اب تو نوبت روحانی،نفسیاتی، جذباتی اور ذہنی جارحیت تک پہنچ گئی ہے۔مگر اس کے باوجود بہت سے سیدھے سادے مسلمان اس خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ تہذیبوں کے تصادم کا وجود نہیں۔

یہ ہر اعتبار سے ایک خطرناک اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے ضرر رساں ذہنی سانچہ ہے اور ہم اس سے جتنی جلد نجات حاصل کر لیں، بہتر ہے۔آخر ہم کب تک خطرے کو بش اور بلیئر، امریکا اور یورپ میں منحصر کر کے حقائق کا منہ چڑاتے رہیں گے اور کب تک مسلمانوں کو اس شعور سے محروم رکھیں گے جس کے بغیر تہذیبوں کے تصادم کے چیلنج سے نمٹنا آسان نہیں۔

تہذیبوں کا تصادم اور سیموئل ہن ٹنگٹن کی شیو

آج ہمیں سیموئل ہن ٹنگٹن کی شیو بنانی ہے۔ مگر کیوں؟

بھارت کے قومی ترانے کے خالق اور بنگالیوں کے گرو دیو رابندر ناتھ ٹیگور کو ان کے شعری مجموعے گیتا انجلی پر ادب کا نوبل انعام ملا تو وہ مغرب میں بھی معروف ہو گئے۔ نوبل انعام ملتے ہی مصنف کی کتابیں دنیا کی تیس چالیس زبانوں میں از خود ترجمہ ہو جاتی ہیں۔ گیتا انجلی کا انگریزی ترجمہ تو خود رابندر ناتھ کر چکے تھے۔ ہمیں ایک دو ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جنھوں نے ٹیگور کو دیکھا ہے۔ ان کے بیان کردہ خاکے کے مطابق ٹیگور کی داڑھی لمبی تھی اور سر کے بال شانوں تک آتے تھے۔ اس پر خیالات میں کھوئے ہونے کا تاثر۔ ماورائیت یا روحانیت کا قصہ اس کے علاوہ۔ ۲۰ ویں صدی میں مشرق کی روحانی اور وہ بھی جسمانیت سے نمودار ہوتی ہوئی۔ مغرب کے لیے اس سے بہتر ماڈل کیا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ٹیگور نے اچھے اچھوں کو چونکا دیا۔

چونکنے والوں میں برنارڈ شا بھی تھے۔ موصوف کو ادب کا نوبل انعام دیا گیا تھا مگر انھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ ادب کا نوبل انعام ہر سال دیا جاتا ہے اور برنارڈ شا ہر سال پیدا نہیں ہوتا۔ روایت کے مطابق شا نے گیتا انجلی پڑھی اور ٹیگور سے ملنے کے لیے بھارت آئے۔ ٹیگور سے مل کر لوٹنے لگے تو ہوائی اڈے پر صحافیوں نے پوچھا: کہیے گرو دیو کو آپ نے کیسا پایا؟ شا کی مشہور زمانہ ذہانت بجلی کی طرح چمکی، فرمایا:

"Shave him he is a fool."

یعنی سارا کمال داڑھی اور لمبے بالوں کا ہے۔ سیموئل ہن ٹنگٹن کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ہم نے ہن ٹنگٹن کو نہیں دیکھا مگر اس کی تصویر دیکھی ہے۔ ہلکی سی داڑھی اور داڑھی میں تنکا۔ لیکن یہ تنکا علمی ہے، اس لیے استرا اور قینچی بھی علمی درکار ہے۔ مگر اس سے قبل سیموئل ہن ٹنگٹن کی شیو کا جواز؟

ہمارے یہاں جب سے تہذیبوں کے تصادم کا شور برپا ہوا ہے، یار لوگ اس خیال کو سیموئل ہن ٹنگٹن سے منسوب کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ انھیں اس سلسلے میں مولانا مودودیؒ کی کتابیں یاد آتی ہیں نہ اقبال اور اکبرالہ آبادی کی شاعری۔ اور تو اور انھیں امام غزالیؒ کا فکری ماڈل بھی یاد نہیں۔

ظاہر ہے جن لوگوں کے ''حافظے'' کا شعوری یا لاشعوری طور پر یہ حال ہے، ان سے یہ توقع ہی عبث ہے کہ وہ مغرب میں یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ ہن ٹنگٹن نے جو کچھ کہا ہے، خود کہا ہے یا اس نے اپنے مغربی سابقین سے خوشہ چینی کی ہے۔ خوشہ چینی بری بات نہیں لیکن ہمیں اس کا علم تو ہونا چاہیے۔ تاریخی ریکارڈ تو بہر حال درست رہنا چاہیے، تو سیموئل ہن ٹنگٹن کی فکر کا سرچشمہ خود مغربی فکر میں کہاں ہے؟

سیموئل ہن ٹنگٹن کے مقالے یا کتاب سے بہت پہلے برنارڈ لیوس کی کتاب "A Middle East Mosaic" شائع ہو چکی تھی۔ ہن ٹنگٹن کی بنیادی فکر اسی کتاب سے ماخوذ ہے بلکہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ برنارڈ لیوس نے جن باتوں کو علمی پیرائے میں کہا ہے، ہن ٹنگٹن نے وہی باتیں عام انداز میں پیش کردی ہیں۔ لیکن کیا برنارڈ لیوس کی فکر مغربی معنوں میں اوریجنل ہے؟

جی نہیں! برنارڈ لیوس سے بہت پہلے مغرب کے ایک بڑے مورخ آرنلڈ ٹائن بی کی ایک کتاب "The world and the west" شائع ہو چکی تھی۔ یہ دراصل بی بی سی پر Reith Lectures کا سلسلہ تھا۔ فرق یہ ہے کہ ان لیکچرز میں ٹائن بی نے جس مفہوم کی ادائیگی کے لیے Encounter کی اصطلاح استعمال کی ہے، برنارڈ لیوس نے اس کے لیے Clash کا لفظ استعمال کرلیا، جسے ہن ٹنگٹن نے بھی اپنالیا۔ لیجیے ہن ٹنگٹن سے بات شروع ہوئی اور ٹائن بی تک آ پہنچی۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ ٹائن بی نے یہ کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی، ورنہ ان کی تصنیف "A Study of History" میں بھی جو بارہ جلدوں میں شائع ہوئی، یہی فکر موجود ہے۔ مغرب میں یہ کتاب تاریخ کے اہم ترین مطالعات میں سے ایک ہے۔ لیجیے معلوم ہوا کہ ہن ٹنگٹن تو خود ایک بچہ ہے اور اس کی پشت پر تو کچھ اور لوگ کھڑے ہیں۔ اب یہ تاریخ کا ایک عجیب چکر ہے، بات کسی کی ہوتی

ہے اور مشہور اور کسی کے حوالے سے ہو جاتی ہے۔ لیکن تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ دعوت کس نے کی، دستر خوان کس نے لگایا اور کھانا کس نے تیار کیا۔ مگر ہمارے یہاں حال یہ ہو گیا ہے کہ لوگ اصل تو خیر کیا، اس کا ترجمہ اور اس پر تبصرہ پڑھنے کی بھی زحمت نہیں کرتے بلکہ اس کی خواہش بھی کم از کم ان کی تحریروں اور گفتگوؤں سے ظاہر نہیں ہوتی۔ اس سے اور کچھ نہیں تو انھیں نیت ہی کا ثواب مل سکتا ہے۔

اگر چہ آرنلڈ ٹوائن بی کا تجزیاتی ماڈل اور طریقہ کار اشپنگلر کے ماڈل اور طریقہ کار سے مختلف ہے، لیکن اشپنگلر کی ''زوالِ مغرب'' کا اثر ٹائن بی پر بھی پڑا ہے۔ اشپنگلر کی زوالِ مغرب ۲۰ویں صدی کے اوائل میں شائع ہوئی لیکن نطشے کی تحریروں میں مغربی تہذیب کے زوال کا شعور اتنا گہرا ہے کہ وہ جمہوریت پر شرمندہ ہے، ثقافتی اضمحلال پر ہراساں ہے، اپنے سامنے موجود نئی نسل کے حافظے کی کمزوری اس کے لیے تشویش کا باعث ہے اور اس نے لکھا ہے کہ ہم نے ماضی میں دیو قامت لوگ پیدا کیے ہیں، اب لگتا ہے کہ بالشتیے پیدا کر رہے ہیں۔ یہ زوالِ مغرب کی اشاعت سے بہت پہلے کی باتیں ہیں۔ لیجیے بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں آ پہنچی ہے۔ اب ہمیں یہ معلوم نہیں کہ سیموئل ہن ٹنگٹن کی شیو ٹھیک سے بنی یا نہیں۔

تہذیبوں کا تصادم۔۔۔صرف بچوں کے لیے

آج کا کالم صرف بچوں کے لیے ہے۔ کوئی بڑا اس کالم سے استفادہ کرتے ہوئے پکڑا گیا تو کالم نویس اس کے خلاف کارروائی کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

پیارے بچو! دنیا میں ہر تہذیب کی بنیاد عقائد پر ہوتی ہے۔ لیکن خود تہذیب کیا ہے؟ آسان الفاظ میں اس کو یوں سمجھ لو کہ عقائد جب فکر و عمل میں ڈھلتے ہیں تو فکر و عمل کے کچھ مظاہر سامنے آتے ہیں۔ یہی مظاہر تہذیب کہلاتے ہیں۔ اسلامی تہذیب یا عیسائی تہذیب کی اصطلاحیں انہی معنوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ عقائد کا اثر زندگی کے ہر گوشے پر پڑتا ہے۔ عقائد کے بدلنے یا خراب ہونے سے تہذیبی مظاہر بھی بدلنے لگتے ہیں۔

اسلامی تہذیب ایک مذہبی تہذیب ہے۔ عیسائی تہذیب بھی کبھی ایک مذہبی تہذیب تھی بلکہ جدید مغربی تہذیب سے قبل دنیا میں جتنی بھی تہذیبیں تھیں، وہ سب کی سب اپنی نہاد میں مذہبی تہذیبیں ہی تھیں۔ یہ صرف جدید مغربی تہذیب ہے جو سرتاپا ایک مادی تہذیب ہے، اس لیے اس کے تہذیبی مظاہر بھی مختلف ہیں۔ تمام تہذیبوں کا دعویٰ ہے کہ تہذیب و ثقافت عقائد سے جنم لیتے ہیں لیکن جدید مغربی تہذیب کا دعویٰ ہے کہ عقائد خود تہذیب و ثقافت کا حاصل ہوتے ہیں۔

جدید مغربی تہذیب اگرچہ ایک مادی تہذیب ہے مگر اس کے بھی کچھ ''عقائد'' ہیں جنہیں عرفِ عام میں نظریات یا تصورات بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن عقائد اپنی کشش اور اپنے ساتھ انسانوں کی انتہائی شدید جذباتی وابستگی سے پہچانے جاتے ہیں۔ چنانچہ جدید مغربی تہذیب میں آپ سرمائے کو برا بھلا کہہ کر دیکھیں یا سرمائے کے آلۂ کار آزادی کے تصور یا جمہوریت کی شان میں گستاخی کریں، اہلِ مغرب آپ کا بھرکس نکال دیں گے اور اس بھرکس سے پتا چل جائے گا کہ یہ محض تصورات یا نظریات نہیں، عقائد ہیں جن کو چیلنج کرنا ''سیکولر کفر'' اور لبرل شرک'' کے برابر ہے اور ارتداد کی سزا موت ہے۔ مذہبی تہذیبوں میں عام طور پر فرد یا افراد ہی موت کی سزا کی زد میں آتے ہیں مگر جدید

مغربی تہذیب کے دائرے میں ملک اور قومیں تک ارتداد کی سزا کی مستحق قرار پاتی ہیں۔

عقائد اور تہذیب کا ایک باہمی تعلق یہ ہے کہ عقائد کی درستی یا خرابی کا اندازہ تہذیبی مظاہر سے ہوتا ہے، اس لیے کہ تہذیب ایک اعتبار سے عقائد کا خارج ہے اور عقائد تہذیب کا باطن ہیں۔ کہنے کو عقائد کا معاملہ بالکل سیدھا اور صاف ہوتا ہے لیکن عقائد کے امکانات کو اجمال یا تفصیل میں سمجھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ مثلاً توحید کا مفہوم واضح ہے لیکن ذرا شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ یا حضرت مجدد الف ثانیؒ کے یہاں توحید کا بیان دیکھ لیجیے۔ اس بیان کو سمجھنے اور جذب کرنے کے لیے ایک عمر چاہیے اور وہ بھی اس صورت میں جب ایمان کی شمع دل میں روشن ہو، استادِ کامل اور فہم رسا دستیاب ہو۔ البتہ عقائد کے مظاہر کو سمجھنا نسبتاً آسان ہے۔ ہم انھیں دیکھتے ہیں، برتتے ہیں، ان کا تجربہ کرتے ہیں اور انھیں محسوس بھی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیبوں کا فرق و امتیاز، ہم آہنگی اور تضاد و تصادم بھی لوگوں کی عظیم اکثریت کو تہذیبی سطح پر سمجھ میں آتا ہے۔ کہنے کو مادی تہذیب ایک آسان ترکیب ہے، مگر اس کے معنی اچھے اچھوں کو معلوم نہیں۔ عیسائیت تثلیث کے تصور پر کھڑی ہے، اور اس کے معنی مسلمانوں کو کیا اکثر عیسائیوں کو بھی معلوم نہیں ہوں گے اور اس کے اطلاقات اور ان اطلاقات کے نتائج کا فہم تو عیسائی مفکرین کے یہاں بھی نایاب ہے۔ اس تناظر میں کہا جاسکتا ہے کہ تہذیبوں کے تصادم کی اصطلاح معنی کے بیان اور ابلاغ کے لیے جتنی موثر ہے، کوئی دوسری اصطلاح اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ مگر بچو! اس بات کو سمجھنے کے لیے کچھ نہ کچھ پڑھنا بھی پڑتا ہے۔ لیکن کیا پڑھا جائے؟ ایک ٹھوس جواب کے ذریعے ہی اس سوال کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ اور اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ان حقائق کے شعور کے لیے کم از کم دو سو اردو اور انگریزی کتب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ کیا کہا یہ تعداد بہت زیادہ ہے؟ اچھا چلیے یہ فہرست مختصر کرتے ہیں۔ ذیل میں پیش ہے تہذیبوں کے تصادم کے فہم کے لیے بنیادی کتب کی ایک فہرست:

۱۔ تہافۃ الفلاسفہ۔ از: امام غزالیؒ

یہ اسلامی اور مذہبی فکر کے تصادم کے بارے میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی کتاب ہے۔ کلاسیکی یونانی فلسفہ تراجم کے ذریعے مسلم مفکرین پر گہرے اثرات مرتب کر رہا تھا۔ اس اثر

کی سب سے بڑی علامت ابنِ رشد ہیں۔ تہافتہ الفلاسفہ میں ابنِ رشد کی فکر کے بنیادی نکات کا جواب دیا گیا ہے۔ غزالی نے یونان کے زیرِ اثر مسلم فلسفیوں کی فکر کو ۲۰ بنیادی مسائل میں ڈھالا اوران کا جواب لکھا۔ بچے پڑھنا چاہیں تو تصادم کو اعلیٰ ترین فکری سطح پر بیان کرنے والی یہ کتاب ''ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ'' لاہور سے برسوں قبل شائع ہوئی تھی۔

۲۔ تہافتہ التہافہ، از: ابنِ رشد

یہ کتاب امام غزالیؒ کی تہافتہ الفلاسفہ کا جواب ہے۔ تہذیبی فکر کے تصادم سے دلچسپی رکھنے والے اگر یہ دیکھنا چاہیں کہ یونانی فکر کا حملہ کتنا شدید اور ابنِ رشد کا جواب کس سطح کا تھا تو اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

۳۔ مکتوباتِ امام ربانی۔ جلد اول، دوئم اور سوئم۔

یہ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ ان مکتوبات میں اسلامی عقائد کا بیان ہے اور کئی خطوط میں اسلامی اور غیر اسلامی عقائد کے امتیازات اور اسلامی تہذیب اور غیر اسلامی تہذیبوں کی عدم مطابقت کے بنیادی امور بیان کیے گئے ہیں۔

۴۔ اقبالؒ کی ساری اردو اور فارسی شاعری اور کم از کم ضربِ کلیم جو اس اعلان کے ساتھ شائع ہوئی۔

ضربِ کلیم

یعنی اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف

۵۔ اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی

۶۔ تنقیحات

۷۔ الجہاد فی الاسلام۔ از: مولانا مودودیؒ

۸۔ جدیدیت۔ یعنی مغربی فکر کی گمراہیوں کا خاکہ

۹۔ وقت کی راگنی۔ از: محمد حسن عسکری

جدیدیت مغربی فکر کے زوال اور اس کے ہولناک اثرات کی مختصر ترین تاریخ۔ وقت کی راگنی ہمیں بتاتی ہے کہ اردو ادب کی روایت کیا ہے اور وہ مغربی روایت سے کتنی مختلف ہے۔ (جاری ہے)

تہذیبوں کا تصادم۔۔۔صرف بچوں کے لیے (۲)

۱۰۔ سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت۔از: ڈاکٹر ظفر الحسن، یہ کتاب بتاتی ہے کہ برصغیر میں سرسید احمد خان اور مولانا حالی نے کس طرح مغربی تہذیب کی اصطلاح Nature کو غلط سمجھا اور اس کا اطلاق ادب کیا، اسلام پر بھی کر ڈالا جس کے تباہ کن فکری نتائج برآمد ہوئے۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ لفظ ''نیچر'' عیسائی، ہندو، جدید مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب میں کن کن معنوں میں استعمال ہوا اور ان معنوں کے درمیان کیا فرق ہے۔اس موضوع پر اس سے زیادہ اچھی کتاب شاید ہی کبھی لکھی گئی ہو۔

۱۱۔ نئی نظم اور پورا آدمی۔۔۔از: سلیم احمد

۱۲۔ مشرق۔۔۔از: سلیم احمد

نئی نظم اور پورا آدمی اردو تنقید کی نہایت ہنگامہ خیز اور اہم کتابوں میں سے ہے۔ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ مغربی فکر کے زیرِ اثر ہمارے ادب سے کس طرح پورے آدمی یا Whole man کا بیان تحلیل ہوا اور اس کی جگہ ادھورے آدمی کا بیان در آیا۔ سراج منیر نے سلیم احمد کے اس تصور کو مابعد الطبیعاتی سطح کا نظریہ قرار دیا ہے۔

مشرق سلیم احمد کی ایک طویل نظم ہے، جس میں مغربی فکر کے زیرِ اثر مسلم معاشروں میں اُقدار کی شکست و ریخت اور علامتوں کی تبدیلی کو بیان کیا گیا ہے۔

۱۳۔ کلیاتِ اکبر الہ آبادی

اکبر الہ آبادی ہمارے عظیم ترین شاعروں میں سے ایک ہیں۔ تہذیبوں کے تصادم کے ابتدائی مراحل دیکھنے ہوں تو اکبر کی شاعری پڑھنا ناگزیر ہے۔ اکبر کی عظمت یہ ہے کہ اقبالؒ تک ان کے زیرِ اثر رہے ہیں۔ اکبر کی تخلیقی سطح اقبال کے ہم پلہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ اکبر نے جو بات طنز و مزاح کے پیرائے میں کہی ہے، اقبال اسے ایک بڑے فکری کینوس میں اعلیٰ ترین سنجیدہ سطح پر

بیان کرتے ہیں۔

۱۴۔ افکارِ سرسید۔ از: ضیاء الدین لاہوری۔ یہ کتاب ضیاء الدین لاہوری صاحب کی چالیس سالہ تحقیقی کاوشوں کا حاصل ہے اور کتاب میں مصنف نے موضوعات کے اعتبار سے سرسید کی فکر کو اقتباسات کی صورت میں جمع کر دیا ہے اور اس کتاب میں سرسید کی فکر کا ست سمٹ آیا ہے۔

15- The Deciline of the West by Oswald Spengler

مغربی تہذیب کے بارے میں اس کتاب کا شمار مغربی ادب کے کلاسک میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب پہلی جنگِ عظیم سے قبل لکھ لی گئی تھی مگر شائع ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ یہ کتاب مغربی تہذیب کی بنیادوں، کلاسکی یونانی فکر اور مغربی تہذیب کے مرحلہ بہ مرحلہ زوال کو بیان کرتی ہے۔ اسے پڑھے بغیر مغربی فکر کے بحران کا اندازہ دشوار ہے۔

16- Crisis of the Modern World

17- The Reign of the Quantity

18- East and West

یہ تینوں کتابیں فرانس کے نومسلم مفکر Rene Guenon کی ہیں جو اسلام لانے کے بعد شیخ عبدالواحد عیسیٰ کہلائے۔ اردو ادب کے اہم ترین نقاد محمد حسن عسکری نے رینے گینوں کو مغرب کی گزشتہ سات سو سالہ تاریخ کا عظیم ترین مفکر قرار دیا ہے۔ ایران کے انقلابی دانشور علی شریعتی نے کہا ہے کہ رینے گینوں کی کتب ۲۰ویں صدی کی اہم ترین دریافتوں میں سے ہیں اور تخلیقی سطح اور اثرات کے اعتبار سے ان کا شمار آئن اسٹائن سے کم نہیں، یہ کتابیں جدید مغربی فکر کی نایاب تنقید پر مشتمل ہیں اور انھیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور جدید مغربی فکر میں کن کن بنیادوں پر تصادم موجود ہے۔

19- Figure of Speech or Figure of Thought?

20- What is Civilization?

یہ دونوں کتابیں رینے گینوں کے معاصر آنند کمار سوامی کی ہیں۔ دوسری کتاب بتاتی ہے کہ مذہبی تہذیبوں میں لفظ تہذیب کے کیا معنی رہے ہیں اور جدید مغربی تہذیب اسے کس مفہوم میں استعمال کرتی ہے۔ پہلی کتاب ثابت کرتی ہے کہ جدید مغربی فکر آرٹ اور تخلیق کے تصور کو پست سے پست تر کرتی ہوئی اس سطح پر لے آتی ہے جہاں انسان، حیوان اور پودوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔

کتابیں تو اور بھی ہیں مگر ان کے ذکرِ خیر سے بات بہت طویل ہو جائے گی۔ اس لیے ہم کتابوں کے عنوانات درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

21- Dimensions of Islam

22- To have a centre

23- Forgotten truth by-Frith job Schuon

24- Beyond the Post Modern mind by-Husto Smith

25- The Rise and Fall of the Great powers. by-Paul Kennedy

26- The End of the History and the Last man by Franci Fukuyama

27- The world in Collision edited by-Ken Booth and Tim Dunne

28- Holy war by Karen Arms Strong

29- The Anatomy of Human Destructiveness. by Eric Fromm

30- Muslims and the West

Zaffer Ishaq Ansari and John Espos ....

اسلام، تہذیبوں کا تصادم اور ہم

اسلام اور مسلمانوں کے تعلق کی تاریخ یہ ہے کہ اسلام نے ہمیشہ مسلمانوں کا دفاع کیا اور آج جب مسلمانوں پر مشکل وقت آیا ہے تو صرف اسلام ہی مسلمانوں کو بچا سکتا ہے۔ مگر مسلمانوں کا یہ عالم ہے کہ وہ تہذیبوں کے خوفناک تصادم کے درمیان کھڑے ہو کر چھوٹے چھوٹے سہاروں کی طرف لپک رہے ہیں اور اسلام کی طرف کوئی ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں رہا۔

اس کا ایک ماڈل جنرل پرویز مشرف ہیں جنھوں نے ۱۱ر ستمبر کی رات اپنی دانست میں امریکا کے طوفانِ بلاخیز کو ٹالا اور معیشت کو مضبوط کرنے کی راہ اختیار کی۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ہم زیادہ بہتر انداز میں اپنا دفاع کر سکیں گے۔ لیکن تہذیبوں کا یہ تصادم مسلسل آگے بڑھ رہا ہے، اس کے مقابلے کے لیے معیشت کی حقیقی مضبوطی اور استحکام بھی ایسا ہی ہے جیسے سونامی سے نمٹنے کے لیے آپ ساحلِ سمندر پر ریت کی دیوار بنا کر کھڑے ہو جائیں یا بپھرے ہوئے سمندر میں ڈوبنے سے بچنے کے لیے تنکے کا سہارا لیں۔ اس ضمن میں بہت سے لوگ یہ تک سوچنے سے قاصر ہیں کہ آدمی سمندر میں ڈوبنے لگے تو آدم اسمتھ کی معاشی لیاقت بھی کام نہیں آتی، البتہ تیرنے کی معمولی سی مہارت بھی بہت ہوتی ہے۔

اس کا ایک اور ماڈل عرب حکمران ہیں جو سمجھ رہے ہیں کہ وقت کو گزارنے کی حکمتِ عملی انھیں بچا لے جائے گی۔ انھیں اندازہ ہی نہیں کہ وہ وقت گزار نہیں رہے، وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ خطرہ کم ہونے کے بجائے مسلسل بڑھ رہا ہے اور وہ لڑے بغیر اپنی شکست تخلیق کر رہے ہیں۔

اس کا ایک اور ماڈل وہ لوگ ہیں جو اپنی جان و مال کی محبت میں مبتلا ہو کر اسلام کی انقلابی روح پر امن نما بزدلی کا پردہ ڈال رہے ہیں۔ لیکن دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ بزدلوں اور کمزوروں کو کبھی امن فراہم نہیں ہو سکا۔ اگر دنیا میں ایک ارب ۳۰ کروڑ انسانوں کی ایک امت ہو اور اس

امت کے پاس ۵۷ آزاد ریاستیں ہوں اوران ریاستوں کے ہاتھ میں تیل کے معلوم ذخائر کا تقریباً ۷۰ فیصد اور گیس کے معلوم ذخائر کا تقریباً ۷۵ فیصد ہواور وہ امت پھر بھی امن کی بھیک مانگ رہی ہوتواس کا جوحشر ہو جائے کم ہے۔

۹/۱۱ کو رونما ہوئے اب چار سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا مگر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اب تک یہ نہیں سمجھ سکی کہ امریکا کے صدر جارج بش اور برطانیہ کے وزیراعظم ٹونی بلیئر تاریخ کی Biblical تعبیر کے دائرے میں رہتے ہوئے سوچ رہے ہیں اوراقدامات کر رہے ہیں۔ مغرب میں جولوگ ان کے ساتھ نہیں، انھیں ان کے ''ہدف'' پرنہیں ہدف تک رسائی کے طریقہ کار پر اعتراض ہے۔ مغرب میں جولوگ ''بائبلانہ تعبیر'' پر یقین نہیں رکھتے وہ سیکولر ہیں۔ عیسائی ہوں یا سیکولر، اسلام اور مسلمانوں کے لیے ہم معنی ہیں۔ عیسائیت اسلام سے ابا کرتی ہے تو سیکولرازم کو کون سی اسلام سے محبت ہے؟ اس کی مثال یہ ہے کہ عراق کے کیک میں حصے کے تنازعے پر ایوانجیلیکل امریکا، پروٹسٹنٹ برطانیہ اور کیتھولک اٹلی ایک طرف ہو گئے اور سیکولر فرانس اور سیکولر جرمنی دوسری طرف، مگر ایران کے خلاف ان سب کے درمیان اتفاقِ رائے پیدا ہو چلا ہے۔

عقلی حکمتِ عملی موثر ہوتی تو آج جنرل پرویز مشرف کامیاب ترین رہنما ہوتے۔ مگر چار سال میں جنرل صاحب کی حکمتِ عملی کا جو حال ہو گیا ہے، اس سے چیلنج کے مقابلے میں افادی فکر کی ہولناک نارسائی ظاہر اور ثابت ہو گی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس منظرنامے میں سیاہ و سفید کے درمیان ایک مٹیالہ علاقہ یا Gray Area بھی ہے۔ مگر یہ مٹیالہ علاقہ سیاہ علاقے کے سائے کے سوا کچھ نہیں۔ یہ ایک نظری دھوکا یا Optical Illusion ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو امریکا آج ہمارے اقتدارِ اعلیٰ کی یوں تضحیک نہ کر رہا ہوتا۔ وہ کچھ اور نہیں تو جنرل پرویز کے لیے تو مشکل کھڑی نہ کرتا۔

مسلمانوں کی ذہنی پستی کا عالم دیکھیے کہ وہ اس سلسلے میں ماضی کے تاریخی نمونوں سے بھی سبق لینے کے لیے تیار نہیں۔ چنگیزی لشکر نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور مسلمانوں کے سیاسی مرکز کو تہہ و بالا کر دیا تھا، یہ ایک مکمل فوجی شکست تھی، مگر یہ ''صرف'' فوجی شکست تھی۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال کے الفاظ میں بالآخر ہوا یہ کہ کعبے کو صنم خانے سے پاسبان فراہم ہو گئے۔ لیکن برصغیر میں انگریزوں کے فوجی غلبے کو سرسید اور ان کی فکر نے ایک تہذیبی غلبے میں تبدیل کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ جنوبی ایشیائی ماڈل کے دائرے میں صنم خانے کو کعبے سے پاسبان فراہم ہونے لگے اور اب تک ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ فوجی شکست اور تہذیبی ہزیمت کے درمیان ایک بہت بڑا امتیاز ہے۔

عصری تناظر میں بھی دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ افغانستان اور عراق کے لوگوں کی بڑی تعداد نے مغرب کی تہذیبی قوت کے آگے سپر ڈالنے سے انکار کر دیا ہے اس لیے وہ عسکری طور پر مضبوط ہیں۔ صرف فوجی شکست تہذیبی شکست میں نہیں ڈھلتی لیکن صرف تہذیبی شکست سے فوجی شکست کی بھی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان باتوں کا مفہوم کیا ہے؟

ان کا ایک مفہوم یہ ہے کہ تہذیبوں کے تصادم میں خالص افادی فکر ہمارے کسی کام کی نہیں۔ ہم نے تجربہ بھی کر کے دیکھ لیا کہ اس سے کچھ برآمد ہونے والا نہیں۔ اگر جارج بش اور ٹونی بلیئر ۲۱ ویں صدی میں تاریخ کی Biblical تعبیر پر انحصار کر سکتے ہیں تو ہم قرآنی تعبیرات پر کیوں انحصار نہیں کر سکتے۔ ان کا ایک مفہوم یہ ہے کہ صرف جنگ کا تصور چیلنج کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ صرف جہاد کے تصورِ میں وہ قوت، کشش اور حسن ہے جو کروڑوں مسلمانوں کی قلبِ ماہیت کر سکتا ہے یا انھیں Transformation کے عمل سے گزار سکتا ہے۔ اس قلبِ ماہیت سے جو ہزار وجوہ سے ہماری بہت بڑی تہذیبی اور عالمگیر ضرورت ہے، صرف معیشت کی مضبوطی کا تصور ایسا ہی ہے جیسے ہمارے وجود کا کوئی ایک گوشہ دوسرے گوشوں کی قیمت پر پھل پھول جائے۔ ہمیں اختیار کی نہیں ترک کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ترک بجائے خود ایک بت بڑا حربہ ہے۔ تصادم اور کشمکش میں قربانی کا سوال ہمیشہ اہم ہو کر سامنے آتا ہے اور انسان کی فطرت ہے کہ وہ خود سے بھی چھوٹی چیزوں کے لیے قربانی نہیں دیتا۔ امریکا کی مخالفت (Anti Americanism) بڑی چیز ہے مگر تہذیبوں کے تصادم کے سامنے اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔

آپ اس تصور کو لوگوں کے سامنے رکھیں گے تو لوگ اس کے لیے کچھ بھی قربان کرنے کو تیار ہو سکتے ہیں۔ ہم چھوٹا نقصان لوگوں کے سامنے رکھ کر انھیں بڑی بڑی قربانیوں پر آمادہ نہیں کر سکتے، اور تہذیبوں کا تصادم کوئی نعرہ بھی نہیں ہے۔ ثابت ہو چکا کہ مغرب کا اصل مسئلہ اسلام، اسلامی تہذیب اور اس کی روح ہے۔ تہذیب کوئی کار نہیں ہے جس کے گڑھے (Dents) کسی ورکشاپ پر دو دن میں دور کرا لیے جائیں۔ ہم برصغیر میں انگریزوں کی آمد کے بعد سے اب تک اپنی تہذیبی سڑک پر "کام جاری ہے" کا بورڈ لگائے کھڑے ہیں۔

جنون، مذہب اور شعور

تاریخی فقرہ ہے اور ایک تاریخی عہد میں دوہرایا جارہا ہے:

''دنیا نقد ہے اور آخرت اُدھار''۔

کیا اس فقرے پر اضافہ ممکن ہے، جی ہاں۔۔۔مگر کیا؟

''دنیا نقد ہے اور آخرت (پاکستان میں) مستقل ادھار''۔

بات سمجھ میں آئی؟ نہیں آئی۔۔۔کوئی بات نہیں۔۔۔ہمارے ایک ملّی نغمے کے بول ہیں:

جنوں سے
اور عشق سے
ملتی ہے
آزادی

یہ بول پسند آئے؟ نہیں آئے تو ایک اور ملّی نغمے کے بول سن لیجیے:

ہے جذبہ جنون
تو ہمت نہ ہار
جستجو جو کرے
وہ چھولے آسمان

یہ ہمارے POP اور JAZZ ملّی نغموں کے مصرعے ہیں۔۔۔مشہورِ زمانہ۔۔۔بچہ بچہ انھیں گنگناتا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''جنون'' پاکستان میں مقبول ہے۔جنون نہ ہوتا تو پاکستان کیسے بنتا؟ ہم کرکٹ کا عالمی کپ کس طرح جیتتے؟ ۴۳ سال میں چار بانکے، سجیلے، چھیل چھبیلے مارشل لاؤں کا تاج ہمارے اجتماعی سر پر کیسے بجتا؟

اس سے قطعِ نظر بھی دیکھا جائے تو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جنون کی بڑی

اہمیت ہے۔کوئی تاجر فنائی التجارت ہو جائے تو ہم کہتے ہیں کہ دیکھو کیسا مثالی تاجر ہے۔۔۔ہیرا ہے ہیرا۔۔۔اسے تمغۂ حسنِ کارکردگی کا اعزاز بخشو۔ملٹی نیشنلز کی ''جہادی ورک فورس'' کو دیکھا جائے تو شہد کی مکھیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔یہ ورک فورس اتنی محنت کرتی ہے کہ پوری زندگی ایک صبح اور ایک شام میں ڈھل جاتی ہے اور ہم کہتے ہیں: صاحب! ملٹی نیشنلز کا کیا کہنا۔ان کا Way of working کمال کا ہے۔کوئی موسیقی، گلوکاری، اداکاری یا کرکٹ کا ہو کر رہ جائے تو ہم کہتے ہیں: فنکار ایسے ہوتے ہیں۔آخر پروفیشنل ازم بھی ایک چیز ہے۔آؤ انھیں اپنے قومی ہیروز کا درجہ دیں۔اس سلسلے میں فن سے شادی کی اصطلاح مشہور ہے جو پیشہ ورانہ جنون کی انتہا کو ظاہر کرتی ہے اور ہماری اجتماعی زندگی کے کئی شعبے تو ایسے ہیں جہاں ہر سال کچھ نہ کرنے کے عوض انعامات دیے جاتے ہیں اور کیوں نہ دیے جائیں، آخر کچھ نہ کرنا بھی ایک فن ہے اور اس کے لیے بھی مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے اور مستقل مزاجی جنون ہی کی ایک جہت ہے۔۔۔جیسا کہ ظاہر ہے یہاں تک معاملات بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔

البتہ مذہب کا حوالہ آتے ہی جنون سے اچانک ''جنونی'' برآمد ہو جاتا ہے۔انسان ذرا سا مذہب کی طرف مائل ہوتا ہے اور لوگ کہتے ہیں: لیجیے یہ تو گئے۔مذہبی رنگ مزید گہرا ہو جائے تو انتہا پسندی کی اصطلاح اچھل کر سامنے آجاتی ہے۔انتہا پسندی اور دہشت گردی اور مذہبی جنونیت میں زیادہ فاصلہ نہیں۔آدمی ایک قدم چلا اور ان اصطلاحوں کی بے رحم تلواروں کی زد میں آیا۔

جن لوگوں کو ۱۱رستمبر سے پہلے کی دنیا یاد ہے، وہ گواہی دیں گے کہ یہ صورتِ حال اس تاریخ سے پہلے بھی موجود تھی البتہ ۱۱رستمبر کے بعد اس کی سنگینی بہت بڑھ گئی۔آخر ایسا کیوں ہے؟ صرف مذہب کے دائرے میں جنون ہمیں کیوں پسند نہیں آتا۔

ذرا عالمی ادب پر نظر ڈالیے۔لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، رومیو جولیٹ، ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، سسی پنوں، عذرا وامق، رادھا کرشن۔۔۔کتنے کردار ہیں جو عشق اور جنون کی علامتوں کے طور پر صدیوں سے سراہے جا رہے ہیں۔بڑی شاعری اور بڑا ڈراما پیدا کر رہے ہیں اور کوئی

نہیں کہتا کہ یہ کیا ہے؟ ان کرداروں کو سب ہی زندگی کی اعلیٰ قدر کی علامت کے طور پر تسلیم کر لیتے ہیں۔ مگر مذہب کا حوالہ آتے ہی بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔۔۔ آخر کیوں؟ بہتر ہے کہ یہاں کالم کی ابتدا کو دوہرا لیں۔ دنیا نقد ہے اور آخرت اُدھار۔۔۔ اور وطنِ عزیز میں تو آخرت کا معاملہ مستقل اُدھار والا ہو گیا ہے۔ حکمرانوں کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ ان کے شعور میں آخرت ''دائمی التواء'' میں ہے۔ مگر معاشرے کا عمومی رویہ؟

معاشرے کی عظیم اکثریت مذہب سے وابستہ تو ہے مگر گزشتہ صدیوں میں اس کی نہاد یا Orientation بدل گئی ہے، خاص طور پر اُن لوگوں کی جو جدید تعلیم کے زیرِ اثر ہیں۔ ان میں سے اکثر کے لیے مذہب اہم تو ہے مگر اتنا نہیں کہ اس میں مسلسل ''ترقی'' کی خواہش تمنا بن جائے۔ ہم ملازمت میں گریڈ ایک سے گریڈ ۲۲ تک سفر کرنا چاہتے ہیں مگر مذہب میں گریڈ ۱۶ سے آگے کی خواہش خطرناک سمجھی جاتی ہے، اور گریڈ ۱۶ بھی یہاں معراج ہے۔ چنانچہ بات رسومات سے آگے مشکل ہی سے بڑھتی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کا مطلب کیا ہے؟

ان کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں زندگی کے عام معاملات میں ''عدم توازن'' فائدہ مند نظر آتا ہے۔ اس سے دولت بڑھتی ہے، مراتب میں ترقی ہوتی ہے، شہرت ہاتھ آتی ہے اور اس سے وہ کامیاب انسان ہمارے سامنے آتا ہے جو عہدِ حاضر کا مثالی انسان ہے۔ اس کے برعکس مذہب میں عدم توازن میں ہمیں کوئی دنیاوی فائدہ دکھائی نہیں دیتا بلکہ الٹا نقصان نظر آتا ہے۔ آخرت اہم ہے، مگر وہ اَن دیکھی یا Unseen ہے اور اس پر یقین اور اعتماد کے لیے اعلیٰ درجے کی ذہانت درکار ہے اور ہمارے معاشرے میں کاروباری ذہانت کی فراوانی ہو چکی ہے۔

جہاں تک جدید تعلیم یافتہ طبقے یا اس کے زیرِ اثر لوگوں کا تعلق ہے، تو وہ کہیں یا نہ کہیں انھیں مذہب ذرا پرانی چیز لگتی ہے اور Antique گھر کی آرائش اور اپنے ذوق کی نمائش کے لیے تو ٹھیک ہے مگر وہ زندگی کو متاثر کرنے لگے تو اسے اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

یہ حقیقت راز نہیں کہ ہمارے حکمراں طبقے اور اس کے آقاؤں تک میں اسلام ایک گہرے خوف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ ہے۔ صرف مذہب میں یہ قوت ہے کہ انسانوں کی نہیں

پوری تاریخ کی قلبِ ماہیت کرسکتا ہے۔صرف مذہب غاصبانہ ''نظام'' کو منہدم کرسکتا ہے۔باقی ہر قوت کنٹرول کی جاسکتی ہے مگر مذہب کی قوت کو کنٹرول نہیں کیا جاسکتا۔حکمران یونہی تو سرکاری علماء پیدا نہیں کرتے رہے۔ یہ مذہب کی قوت کو کنٹرول کرنے کی واحد صورت ہے جو پوری اسلامی تاریخ میں مسلسل بروئے کار آتی رہی ہے۔لیکن کیا مذہب واقعتاً توازن پیدا کرتا ہے؟

میر تقی میر کا ایک بے مثال شعر ہے:

خوش ہیں دیوانگیٔ میرؔ سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

یہاں اندھا دھند کچھ نہیں ہے، کسی عدم توازن کا دور دور تک نام ونشان نہیں، اس جنون کا خمیر شعور سے اٹھا ہے۔اس کا انگریزی ترجمہ ہے: Design in madness۔اس جنون کے بغیر نہ کبھی دنیا بدلی ہے نہ بدلے گی۔اس جنون کے بغیر زندگی میں کبھی جمال پیدا ہوا ہے، نہ ہوگا۔میر صاحب کا ایک اور شعر یاد آ گیا:

تمنائے دل کے لیے جان دی
سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے

سرسید، دوقومی نظریہ اور تہذیبوں کا تصادم

سرسید انگریزوں کے ایجنٹ ضرور تھے، انھوں نے انگریز افسروں کو خط لکھ لکھ کر یہ بھی بتایا کہ مجاہدین کہاں کہاں روپوش ہیں۔ انھوں نے مجاہدوں کو وحشی اور حرامزادے بھی کہا۔ یہ تمام باتیں اب ناقابلِ تردید دستاویزی شہادتوں سے ثابت ہو چکی ہیں لیکن سرسید کو جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا سیموئل ہن ٹنگٹن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ایک زمانہ ایسا ضرور تھا جب سرسید ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک خوب صورت دلہن کی دو آنکھیں سمجھتے تھے۔ لیکن جلد ہی انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ تمھیں اپنے مفادات عزیز ہیں تو کانگریس کے پلیٹ فارم سے جدوجہد کرنے کے بجائے اپنی تنظیم قائم کرو، کیونکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مفادات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس بنیاد پر انھیں دوقومی نظریے کا بانی بھی کہا جاتا ہے اور دوقومی نظریہ تہذیبوں کے تصادم کے نظریے کے سوا کیا تھا۔ یا تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ اپنی نہاد میں دوقومی نظریے کے سوا کیا ہے؟ آپ اس سلسلے میں چینی (Chinies) تہذیب کو بھی شامل کرلیں تو زیادہ سے زیادہ اسے تین قومی نظریہ قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن دوقومی نظریے پر آج تک رال ٹپکانے والے بعض افراد بھی تہذیبوں کے تصادم پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

قائداعظم اپنی تعلیم و تربیت میں جدید ضرور تھے مگر ہندوؤں کے تناظر میں پیش کیے گئے دوقومی نظریے کی وضاحت میں انھوں نے دن رات ایک کردیے اور دوقومی نظریے کی تشریح گائے اور لوٹے کی سطح تک کی۔ انھوں نے کہا کہ ہندو گائے کو ''ماتا'' کہتے ہیں، اسے پوجتے ہیں اور مسلمان اس کو کاٹ کر کھاتے ہیں۔ ہندوؤں کے لوٹے میں ٹینٹو نہیں ہوتا کیونکہ ہندوؤں میں پاکی اور ناپاکی کا شعور نہیں چنانچہ لوٹے کی ٹینٹو مسلمانوں کی ایجاد یا لوٹے پر مسلمانوں کا اضافہ ہے۔

اقبال کا معاملہ ان دونوں شخصیتوں سے مختلف ہے۔ چنانچہ اقبال نے شری رام کو امامِ ہند کہا ہے۔ کرشن کے فلسفۂ عمل کو سراہا ہے اور گرونانک کی تعریف کی ہے۔ یہ اقبال کی وسیع المشربی

ہے۔ لیکن اقبال بھی ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' گاتے گاتے اچانک مسلم ریاست کے مطالبے کی طرف چلے گئے اور تصورِ پاکستان کے خالق کہلائے۔ اقبال کی شاعرانہ فکر میں، جوان کی بنیادی، اساسی اور حقیقی فکر ہے، مغرب سے اسلام کا تعلق بھی واضح ہے۔ انھوں نے صاف کہا ہے کہ مغرب کی جدید فکر انسان اور حقیقت کے درمیان سب سے بڑا حجاب ہے اور یہ فکر بت تراشتی بھی ہے، انھیں فروخت بھی کرتی ہے اور انھیں پوجتی بھی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اقبال سرسید اور قائداعظم سے بہت الگ نظر آتے ہیں۔ لیکن سرسید کا مسئلہ کیا تھا؟ وہ زندگی کے ایک بڑے حصے میں مسلمانوں کو ہندوؤں سے دور اور انگریزوں سے قریب ہونے کا مشورہ کیوں دیتے رہے؟

سرسید کی نفسیات حاکم اور محکوم کی نفسیات تھی۔ یہ سرسید کے بارے میں بنیادی بات تھی۔ سرسید مسلمان تھے اور مسلمانوں نے ہندوؤں پر ایک ہزار سال تک حکمرانی کی تھی۔ چنانچہ سرسید کو ہندوازم بھی اسلام کے مقابلے پر حقیر نظر آتا تھا اور ہندو بھی معمولی دکھائی دیتے تھے۔ آخر ہندو مسلمانوں کی ''رعیت'' رہے تھے۔ پھر ان کے قریب کیسے جایا جاسکتا تھا اور ان کے ساتھ کیسے چلا جاسکتا تھا اور انگریزوں نے مسلمانوں پر فوجی غلبہ حاصل کرلیا تھا۔ چنانچہ سرسید کو اسلام اور عیسائیت میں مماثلتوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مسلمان ہر اعتبار سے انگریزوں اور ان کی تہذیب کو اپنے لیے نمونہ بنائیں۔ حالانکہ اسلام اور عیسائیت کے درمیان بھی امتیازات نمایاں تھے لیکن یہ امتیازات سرسید کو کبھی نظر نہیں آئے۔ آج بھی بہت سے لوگ دو قومی نظریے کے تو قائل ہیں مگر تہذیبوں کے تصادم کی بات انھیں ہضم نہیں ہوتی اور وہ تہذیبوں کے تصادم کو اسلام کے مفادات کے خلاف سمجھتے ہیں۔

ان تمام امور کا تجزیہ دلچسپ بھی ہے اور چشم کشا بھی۔ کسی کو توفیق ہو تو اس پر شرمندہ ہو کر بہتر تفہیم تک بھی جاسکتا ہے۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں نے برصغیر پر ایک ہزار سال حکومت کی اور ہندوازم کو سمجھ کر نہیں دیا۔ حالانکہ مسلمانوں نے ہندوازم کو سنسکرت سے براہِ راست پڑھ کر اس کے چار پانچ

سو ماہرین پیدا کر لیے ہوتے تو جنوبی ایشیا میں اسلام کی بہت بڑی خدمت کی جا سکتی تھی اور ممکن تھا کہ پورا برصغیر مسلمان ہو جاتا۔ اس کی دو بڑی وجوہ ہیں، ایک یہ کہ ویدوں بالخصوص ویدانت یعنی ویدوں کے آخری حصے میں جو ویدوں کی روح ہے توحید بلکہ توحیدِ خالص کا بیان ہے۔ شنکر آچاریہ نے اس حصے کی جس فکری سطح پر جا کر تعبیر کی ہے، عیسائیت کے بڑے سے بڑے عالموں کے یہاں بھی توحید کی تعبیر کی وہ سطح نہیں ملتی۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں حضورِ اکرمؐ کی بعثت کی جتنی واضح پیشگوئیاں موجود ہیں، اتنی واضح پیشگوئیاں تو توریت اور انجیل میں بھی نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں دو مقامات تو ایسے ہیں جہاں آپؐ کا اسم گرامی احمد اور محمد ''مہامد'' کے لہجے کے ساتھ موجود ہے۔ حضور اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کے حوالے سے ثانوی مواد تو بکثرت ملتا ہے، ان امور کو تبلیغِ اسلام کے سلسلے میں جس موثر طریقے سے بروئے کار لایا جا سکتا تھا، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب ہندوازم کے عالم پیدا کر کے ہندوازم کے متعلقہ حصوں کے ترجمے کو بڑے پیمانے پر پھیلایا جاتا۔ لیکن ہم ہندوازم کو کیوں پڑھتے؟ ہم حاکم تھے اور ہندو محکوم۔ اسلام غالب تھا اور ہندوازم مغلوب۔ اور حاکموں کو کیا پڑی ہے کہ وہ اپنے غلاموں اور محکوموں کے عقائد و نظریات کھنگالیں۔ اس کے برعکس مغربی تہذیب اور انگریزوں کے حوالے سے ہم نے تین چار دہائیوں ہی میں سرسید اور مولانا حالی بھی پیدا کر لیے اور علی گڑھ کالج بھی قائم کر لیا۔ ''تہذیب الاخلاق'' بھی جاری ہو گیا اور سائنٹفک سوسائٹی بھی بن گئی۔ مغرب کی شاعری اور ناول و افسانے بھی چل پڑے اور مولانا حالی نے پورے خلوص اور علمی وقار کے ساتھ مقدمۂ شعر و شاعری لکھ کر روایتی شاعری کی بنیادیں کھود ڈالیں اور اس کی وجہ صرف یہ تھی۔ انگریز غالب تھے اور ہم مغلوب۔ غلاموں کی نفسیات کتنی عجیب، کتنی پست اور کتنی سرسری ہوتی ہے؟ ایک جانب ایک ہزار سال میں بھی ایک مذہب، ایک تہذیب اور ایک بڑی آبادی کو نہیں سمجھا جاتا اور دوسری جانب پچاس سال میں دوسری تہذیب کے ماہرین، قائلین اور متاثرین پیدا ہو جاتے ہیں۔ طاقت کے پجاریوں اور جہلِ مرکب کی علامتوں کو آداب۔ (جاری ہے)

سرسید، دوقومی نظریہ اور تہذیبوں کا تصادم (۲)

بعض لوگوں کو آج خیال آتا ہے کہ اسلام اور جدید مغرب میں سیاہ و سفید کا تعلق تھوڑی ہے۔ ہمارے درمیان مماثلتیں بھی موجود ہیں۔ اس حوالے سے کچھ لوگوں کو وسیع تر انسانی میراث یاد آتی ہے۔لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو دوقومی نظریے کے وقت یہ بات یاد نہیں آئی۔اس وقت کہا گیا کہ ہندوازم اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔اگر یہ بات درست تھی تو یہی بات جدید مغربی تہذیب کے سلسلے میں کیوں درست نہیں۔جبکہ ہندوازم بہرحال ایک مذہب تھا اور جدید مغربی تہذیب اپنی بنیاد میں ایک سیکولر تہذیب ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ کل دوقومی نظریے کو درست ثابت کرنے میں ''فائدہ'' تھا اور آج اسلامی تہذیب اور جدید مغربی تہذیب میں مماثلتیں تلاش کرنے میں ''فائدہ'' ہے۔ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا مگر سوال یہ ہے کہ اس تناظر میں اسلام اور اس کا اصولِ صداقت کہاں ہے؟

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تہذیبوں کے تصادم سے وہ امکانات زائل ہو جائیں گے جو مغرب میں اسلام کے حوالے سے پیدا ہوئے ہیں۔ وہاں لوگوں کی بڑی تعداد مسلمان ہو رہی ہے۔ تہذیبوں کا تصادم اس عمل کو روک دے گا۔ بالفرضِ محال اس بات کو درست مان بھی لیا جائے تو بھی مسئلہ یہ ہے کہ جنوبی ایشیا اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے دنیا کا سب سے زرخیز علاقہ ہے۔محمد بن قاسم ۷۱۱ء میں سندھ آئے تو اس وقت علاقے میں مسلمانوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔آج اس علاقے میں افغانستان سمیت مسلمانوں کی تعداد ۵۵ کروڑ ہے۔آپ کا کیا خیال ہے، یہ تمام ''عرب'' ہیں۔ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ان کی عظیم اکثریت معروف معنوں میں نومسلموں اور ان کی آل اولاد پر مشتمل ہے۔جس وقت دوقومی نظریہ وضع ہوا، اس وقت بھی مسلمانوں کی آبادی اس علاقے میں ۶ کروڑ سے زائد تھی لیکن اس وقت تو کسی کو خیال نہیں آیا کہ پاکستان بننے سے جنوبی ایشیا میں اسلام کی پیش قدمی رک جائے گی۔اگر اس سلسلے میں دلیل یہ

ہے کہ اسلام کی پیش قدمی پاکستان بننے سے بھی نہیں رکی تو سوال یہ ہے کہ تہذیبوں کے تصادم سے مغرب میں اسلام کی پیش قدمی کیونکر رک جائے گی؟

تجزیہ کیا جائے تو یہاں بھی مسئلہ یہی سامنے آتا ہے کہ ہندوؤں کے تناظر میں ہم حاکم تھے۔ ہم خود کو برتر سمجھتے تھے اور جدید مغرب کے تناظر میں مغرب ہم سے برتر ہے اور ہم اس کے غلام ہیں اور ایک ایسا احساسِ کمتری ہمارے اندر بیٹھا ہوا ہے کہ جو صورتیں بدل بدل کر ہمارے سامنے آتا رہتا ہے۔ یہ ایک منظرنامے کا ایک اور دلچسپ نکتہ ہے کہ ہندوازم سے اسلام کو مسلسل خطرہ لاحق تھا لیکن جدید مغرب سے اسلام کو کوئی خطرہ نہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہم نے ہندوازم کی کوئی بنیادی چیز اختیار نہیں کی ہوئی تھی جبکہ جدید مغربی تہذیب کی تمام بنیادی چیزیں ہم نے اختیار کی ہوئی ہیں۔ یعنی ہندوازم سے دور ہو کر بھی ہمیں خطرہ لاحق تھا اور ہم دوسو سال سے مغرب کی گود میں بیٹھے ہوئے ہیں مگر اس کے باوجود ہمیں اس سے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔

ان گزارشات کا مطلب یہ نہیں کہ دوقومی نظریہ غلط تھا اور پاکستان غلط بنا۔ دوقومی نظریہ بالکل درست تھا اور پاکستان کا قیام مسلمانوں کی تاریخ کے عظیم ترین واقعات میں سے ایک ہے لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ دوقومی نظریہ جو کبھی جنوبی ایشیا کے جغرافیائی تناظر میں اپنا اظہار کر رہا تھا، وہ آج تہذیبوں کے تصادم میں عالمی سطح پر خود کو ظاہر کر رہا ہے۔ محدود تناظر میں دوقومی نظریے کے جو تقاضے تھے، وہی تقاضے عالمی سطح پر ظاہر ہونے والے دوقومی نظریے کے ہیں۔ لیکن کنوئیں کے مینڈک سمندر کو دیکھ کر گھبرا گئے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ تاریخ کو سراہنا اور اسے بسر کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔ آج ہم اقبال اور قائداعظم کی فکروعمل پر تنقیدی نکتے پیدا کرتے ہیں اور خود کو دانش ور سمجھتے ہیں مگر انھوں نے اپنی تاریخ اور اپنے عہد کے تقاضے کو بسر کر کے دکھا دیا۔ اس وقت کی برصغیر کی ملتِ اسلامیہ میں ہزار خرابیاں ہوں گی مگر وہ تاریخ کے امتحان سے سرخرو نکلی۔ آج ایک اور امتحان ہمارے سامنے ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ کوئی کنوئیں میں پڑا ٹرا رہا ہے۔ کوئی اسلام کی امن پسندی کی آڑ میں پڑا اینٹھ رہا ہے اور کسی نے شترمرغ کی طرح زمین میں منہ دے دیا ہے۔ (دوسری اور آخری قسط)

تہذیبوں کا تصادم امام غزالیؒ کے دور میں

بعض لوگ نامعلوم اسباب کی بنا پر تہذیبوں کے تصادم سے اس طرح بھڑکنے لگے ہیں کہ لال رومال اور بیلوں کے باہمی تعلق کے کئی قصے یاد آجاتے ہیں۔ حالات یہی رہے تو بچے ایسے لوگوں کو تہذیبوں کا تصادم کہہ کر چھیڑیں گے اور وہ لفظوں کے پتھر اور پتھروں کے لفظ لے کر ان کے پیچھے دوڑیں گے۔ خیر یہ بھی دو طرفہ معنوں میں ایک تہذیبی خدمت ہوگی۔ لیکن کسی کو خوش یا ناراض کرنے سے قطعِ نظر آج ہم دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ آج سے صدیوں پہلے حضرت امام غزالیؒ کے دور میں تہذیبوں کے تصادم کی کیا صورت تھی؟ اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب کے لیے مغربی تہذیب کا چیلنج کیا تھا اور امام غزالیؒ نے اس چیلنج کا کیا جواب دیا؟

امام غزالیؒ ۵۰۵ ہجری میں پیدا ہوئے اور آج ہم ۱۴۲۷ ہجری میں سانس لے رہے ہیں۔ اس طرح ہمارے اور ان کے درمیان ۹۲۲ سال کا فصل ہے۔ لیکن تہذیبوں کا تصادم اپنے عروج پر تھا بلکہ اس کی فکری سطح اتنی بلند تھی کہ اس کی تفہیم خود امام غزالیؒ کے زمانے میں بھی عام نہیں تھی اور آج کل تو لوگ اخبارات اور ٹی وی کی ''شرابِ علم'' کے نشے میں سرشار رہتے ہیں۔ ان کے لیے تو اس سطح کا اندازہ بھی دشوار ہے۔

یاد رہے کہ یہ بدنامِ زمانہ یا مشہورِ زمانہ اصطلاح کے مطابق مسلمانوں کے زوال کا عہد نہیں تھا۔ مسلمان ایک بہت بڑی سیاسی طاقت تھے، فکری حوالے سے وہ دنیا کی امامت کر رہے تھے۔ یہ الکندی، فارابی، ابنِ سینا اور ابنِ رشد کا تخلیق کیا ہوا عہد تھا۔ یونان کی فکر اور فلسفے کو صدیوں بعد نئے شارحین فراہم ہو رہے تھے اور یہیں سے وہ چیلنج جنم لے رہا تھا جس کا جواب اگر نہ دیا گیا ہوتا تو خدانخواستہ مسلمانوں کے مقاصد و نظریات اور پوری تہذیب کی عمارت منہدم ہو جاتی۔

آج مغربی تہذیب پر تنقید کے کئی آسان نسخے دستیاب ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ مغربی تہذیب عریانی و فحاشی پھیلا رہی ہے گویا مغربی تہذیب کی تنقید کا حق ادا ہو جائے گا۔ کچھ لوگوں کی

فکری سطح مزید بلند ہے، چنانچہ وہ مغرب کے خلاف سیاسی و معاشی شکایتوں کا دفتر کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اس سے بھی آگے جاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب ایک مادی تہذیب ہے۔ یہ مغربی تہذیب کی تنقید کی بلند ترین سطح ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بات عریانی کی ہو یا مادی تہذیب کی، فکر کی سطح نعرے بازی کی سطح سے بلند نہیں ہو پاتی۔ لیکن غزالیؒ کے عہد کا مسئلہ اس سے زیادہ سنگین تھا۔

اگر چہ مسلم فلسفی مکمل طور پر مغربی فکر کے زیرِ اثر چلے گئے تھے لیکن وہ اسلامی عقائد یعنی توحید، رسالت اور آخرت کے منکر نہیں تھے، بلکہ وہ عقائد کے دائرے میں رہتے ہوئے عقلیات کا ایک ایسا سانچہ وضع کر چکے تھے جسے بادی النظر میں غیر اسلامی کہنا آسان نہیں تھا لیکن جو تھا مسلمہ عقائد سے متصادم۔ چنانچہ یہ اسلامی اور مغربی تہذیب کا سب سے بڑا چیلنج تھا، لیکن امام غزالیؒ نے تنِ تنہا یہ معرکہ لڑا اور یونانی عقلیات کا بیج ہی مار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید مغرب کے مفکرین ہی نہیں، مسلم دنیا کے اکثر جدیدیے آج بھی غزالیؒ کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ لیکن غزالیؒ نے یہ کام کیسے کیا؟

غزالیؒ سمجھ گئے تھے کہ مغربی فکر کے جواب کے لیے اسے سمجھنا ناگزیر ہے، چنانچہ انھوں نے یونان کا سارا فلسفہ گھول کر پی لیا، چنانچہ غزالیؒ کا طریقۂ تنقید یہ بنا کہ مغربی فکر کو سمجھو اور خود اس کے داخلی تضادات اور نقائص کی تفہیم کے ذریعے مغرب کے فکری، ہتھیار اسی کے خلاف استعمال کرو۔ یہ طریقہ مغرب کو مغرب کی زبان میں جواب دینے سے عبارت ہے۔ لیکن غزالیؒ یہاں تک محدود نہیں رہے، انھوں نے یونانی عقلیات کے مقابل اسلامی عقلیات کی عمارت بھی تعمیر کی اور اس نکتے پر اصرار کیا کہ مذہبی فکر کو صرف اسی کے دائرے اور پیمانے کے مطابق سمجھا جاسکتا ہے، اس کے لیے یونانی عقلیات کفایت نہیں کرتیں۔ غزالیؒ کا یہ فکری سانچہ ایسا ہے کہ آج بھی ہمارے کام آسکتا ہے۔ لیکن آج کل تو اسلام اور مغرب کو آمیز کرنا سب سے بڑا فیشن بنا ہوا ہے اور جن لوگوں کو اسلام کے ''الف'' سے مغرب کے ''م'' اور تہذیب کی ''ت'' کا علم نہیں وہ بھی فکری اکھاڑے میں لنگوٹ باندھے کھڑے ہیں۔ خیر تماشے کی بھی اپنی تہذیبی اہمیت ہے،

تہذیبوں کے تصادم میں ہمیں اسلامی تماشے بھی درکار ہوں گے، مگر سوال تو یہ ہے کہ غزالیؒ کے سامنے فکری سوالات کیا تھے؟

غزالیؒ نے ''تہافتہ الفلاسفہ'' میں سوالات یا مسائل کی جو فہرست مرتب کی ہے، وہ یہ ہے:

(۱) قِدم عالم کا ابطال یعنی یہ سوال کہ عالم قدیم ہے یا نہیں؟ (۲) ابدیتِ عالم کا ابطال۔ یعنی ابدیت عالم کا سوال پہلے سوال کی شاخ ہے یا نہیں؟ (۳) اللہ تعالیٰ کو اس عالم کا صانع اور فاعل تسلیم کرنے کے معنی۔ (۴) اثباتِ توحید اور فلسفیوں کی ناکامی۔ (۵) کیا اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی دوئی ثنویت کا سبب ہے؟ (۶) کیا اللہ تعالیٰ کا وجود ثابت ہے؟ (۷) کیا مبدأ اوّل کو جنس وفصل کی اصطلاحوں میں بیان کیا جا سکتا ہے؟ (۸) کیا مبدأ اوّل کو ماہیت و وجود کے خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟ (۹) کیا مبدأ اوّل جسم نہیں؟ جسم قدیم اور جسم حادث میں فرق۔ (۱۰) علت والعلل سے وجود ثابت نہیں ہوتا۔ (۱۱) علم الٰہی سے متعلق اہلِ سنت کا عقیدہ۔ (۱۲) مبدأ اوّل کے علم اور اختیار اور ارادے کا باہمی تعلق کیا ہے؟ (۱۳) کیا اللہ تعالیٰ کا علم جزیات پر محیط نہیں؟ (۱۴) حرکِ افلاک کی توجیہات۔ (۱۵) حرکتِ افلاک کی غایت ومحرک۔ (۱۶) لوحِ محفوظ کی تعبیر۔ (۱۷) اسباب ومسببات کا تعلق۔ (۱۸) انسانی وحیوانی قویٰ کی تفصیل۔ (۱۹) کیا نفوسِ انسانی سرمدیت کے حامل ہیں؟ (۲۰) نفس اور روح کا انجام کیا ہوگا؟

یہ وہ مسائل اور سوالات تھے جو غزالیؒ کے سامنے چیلنج کی طرح کھڑے تھے اور ان کے مضمرات عقائد ونظریات تک نہیں تہذیب کے ادنیٰ سے ادنیٰ مظہر تک برآمد ہوئے، لیکن غزالیؒ نے اس چیلنج کا ایسا جواب دیا جو آج بھی ہمارے لیے ایک ماڈل ہے۔ تہذیبوں کا وہ تصادم جو غزالیؒ سے اب تک عنوانات بدل بدل کر جاری ہے، اس میں ہمارے لیے سلامتی کی راہ یہی ہے کہ ہم مسئلے کا ادراک کریں، ورنہ ہمارے پاس لال رومال اور بدکتے ہوئے بیلوں کے سوا کچھ نہیں رہ جائے گا۔ وماعلینا الا البلاغ۔

تہذیبوں کا تصادم۔۔۔اکبرالٰہ آبادی کی شہادتیں

اکبرالٰہ آبادی اردو کے عظیم ترین شاعروں میں سے ہیں۔ان کی تخلیقی صلاحیت میر، غالب اور اقبال کی سطح کی ہے۔مگر چونکہ ان کا اسلوب طنزیہ اور مزاحیہ ہے، اس لیے ہم انھیں مزاحیہ شاعر کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔اکبر کی اہمیت اس لیے بھی کم سمجھی گئی کہ اکبر کی شاعری کا بیشتر مواد مذہبی روح سے ماخوذ ہے، اس لیے ترقی پسند نقادوں کی بڑی تعداد نے ان پر قدامت پسندی اور رجعت پرستی کا لیبل آویزاں کردیا۔لیکن اکبر کی عظمت یہ ہے کہ اقبال جیسے شاعر نے ان کے رنگ اور اسلوب کی پیروی کی اور اکبر کے انتقال پر انھوں نے اکبر کے فرزند کے نام جو تار بھیجا، اس میں لکھا کہ آپ کے والد نابغۂ روزگار تھے اور جنوبی ایشیا میں نہیں، پورے ایشیا میں ان کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔اکبر کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اقبال نے بعدازاں اپنی شاعری میں مغرب کی جو بے مثال تنقید فکر کی نہایت اعلیٰ سطح پر لکھی، اس کا ایک حصہ اکبر کی فکر سے ماخوذ ہے۔فرق یہ ہے کہ اکبر نے جو نکتہ طنز و مزاح کے پیرائے میں بیان کیا ہے، اقبال کے یہاں وہ نکتہ فلسفیانہ سنجیدگی کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

زیرِ بحث موضوع کے حوالے سے اکبر کے سلسلے میں یاد رکھنے کے لائق ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ۱۹۲۱ء میں ہوا۔اس طرح اکبر نے ۸۲ سال کی عمر پائی۔تہذیبوں کے تصادم کے حوالے سے یہ بھی بیان کرنے کے لائق بات ہے کہ اس نظریے کو پیش کرنے والا امریکی اسکالر سیموئل ہن ٹنگٹن بیچارہ ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوا۔اس طرح وہ اکبر کے انتقال کے سات سال بعد اس دنیا میں آیا۔اگر ہمیں صحیح یاد ہے تو تہذیبوں کے تصادم سے متعلق ہن ٹنگٹن کا مقالہ ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس مقالے کی اشاعت سے ۷۲ سال پہلے اکبر اس دارِ فانی سے کوچ کر چکے تھے۔چنانچہ کم از کم اکبرالٰہ آبادی پر یہ گھٹیا الزام عائد نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی فکر ہن ٹنگٹن کے فکری نوالوں سے ماخوذ ہے۔

یہاں یہ حقیقت بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اکبر کے یہاں تہذیبی تصادم کی شہادتیں ایک آدھ نکتے تک محدود نہیں، توحید، خدا، وحی، رسالت، علم، تعلیم، تہذیب، سائنس اور فلسفے سے لے کر اشیاء تک میں اکبر نے یہ دکھا دیا ہے کہ ہماری تہذیبی اساس مغرب کی تہذیبی اساس سے اور ہمارے تہذیبی مظاہر مغرب کے تہذیبی مظاہر سے کتنے مختلف ہیں اور ان کے مابین کہاں کہاں اور کتنا تصادم یا عدم مطابقت ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ اس کا مطالعہ پاکستان ہی نہیں، ساری دنیا کے مسلم دانشوروں، سیاسی قائدین اور عام افراد کو کرنا چاہیے۔ اس کی ضرورت ہم جیسے لاعلموں ہی کو نہیں، اُن لوگوں کو بھی ہے جو اسلام اور مغرب کے علم کی بوریاں سروں پر رکھے گھوم رہے ہیں۔

ہم نے کلیاتِ اکبر سے موضوعات کی بنیاد پر کچھ اشعار منتخب کیے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ اکبر کی پوری کلیات کا مطالعہ بھی نہیں ہے۔ ہمارے پاس اس کا وقت ہی نہیں۔ ہم نے تو بس یہاں وہاں سے چند اشعار اٹھا لیے ہیں اور انھیں عنوانات کے تحت آپ کے مطالعے کے لیے پیش کر دیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

توحید

خدا کی ہستی میں شبہ کرنا اور اپنی ہستی کو مان لینا
پھر اس پہ طرّہ اس اِدّعا کا کہ ہم ہیں اہلِ شعور ایسے

دنیا میں بے خبر ہے جو پروردگار سے
شاید ہے زندہ اپنے ہی وہ اختیار سے
اے صانعِ ازل تری قدرت کے میں نثار
کیا صورتیں بنائی ہیں مشتِ غبار سے
تمھاری بحثوں سے میرے شبے خدا کی ہستی میں کم نہ ہوتے
مگر یہ بات آ گئی سمجھ میں خدا نہ ہوتا تو ہم نہ ہوتے

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے

ذہن میرا وہ قیامت کہ دو عالم پہ محیط
آپ ایسے کہ مرے ذہن میں آہی نہ سکے

ہو دعوئ توحید مبارک تمھیں اکبرؔ
ثابت بھی کرو اس کو مگر طرزِ عمل سے

ذہن میں جو گھر گیا لاانتہا کیونکر ہوا؟
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا؟
شارحِ دیوانِ ہستی ہے قیاسِ مغربی
ہے ازل بھی تجربوں کے زیرِ فرماں ان دنوں

منزلوں دُور اُن کی دانش سے خدا کی ذات ہے
خرد بیں اور دُوربیں تک ان کی بس اوقات ہے

علم

علم نے، رسم نے، مذہب نے جو کی تھی بندش
ٹوٹی جاتی ہے وہ سب بند کھلے جاتے ہیں

علمِ یورپ کا ہوا میداں وسیع
رزق میں بندی کے تنگی ہو گئی

کفر نے سائنس کے پردے میں پھیلائے ہیں پاؤں
بے زباں ہے بزمِ دل میں شمعِ ایماں ان دنوں

ہم تو انساں سے بنے جاتے ہیں بندر اے حضور
آپ خوش قسمت تھے بندر سے جو انساں ہو گئے

مجھے اس درس سے خواہش تھی روحانی ترقی کی
یہاں ہر چیز لیکن مادی و عنصری نکلی

علمِ دیں مفقود ہے گم ہے صراطِ مستقیم
خضرِ رہ بنتا ہے ہر غولِ بیاباں ان دنوں
بڑھ رہا ہے کفر زلفِ علت و معلول سے
حسنِ فطرت ہے حجابِ روئے یزداں ان دنوں

انسان اگر معرفتِ حق سے ہو غافل
کیا شک کہ بہائم ہیں اس انسان سے بہتر
علمِ دنیوی کے بحر میں غوطے لگانے سے
زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

(جاری ہے)

تہذیبوں کا تصادم۔۔۔اکبرالٰہ آبادی کی شہادتیں (۲)

تعلیم

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جنابِ ڈارون کو حضرتِ آدمؑ سے کیا مطلب؟

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یوں ہے کہ گویا آبِ زم زم مے میں داخل ہے

نقصِ تعلیم سے اب اس کی سمجھ ہی نہ رہی
دل تو بڑھ جاتا تھا اجداد کے افسانے سے
شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر
گرا کرتی ہیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر
بس اصلِ کارِ دیں تو صرف تسبیح و قناعت ہے
عوام الناس باہم جنگ کرتے ہیں زوائد پر

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

مذہب، سائنس، فلسفہ، پردہ

کیا ہے مذہب، ایک ملکی اور سوشل انتظام
یہ نہیں پہچان ہر گز کافر و دیں دار کی

ضعفِ مذہب ہو گیا ہے باعثِ طولِ سخن
گفتگو عامی سے ہو یا بحث ہو ذی جاہ سے

ہیں ترے ہی واسطے اکبر یہ سارے شہدے
دیکھ تو ان کے یہاں مذہب کا ساماں ان دنوں

مذہب کبھی سائنس کو سجدہ نہ کرے گا
انسان اڑیں بھی تو خدا ہو نہیں سکتے

مذہب کا دم وہ بھرتے ہیں بے پردہ بتوں کو کرتے ہیں
اسلام کا دعویٰ ایک طرف یہ کافر ادائی ایک طرف

شانِ مذہب پہ رہا فلسفہ حیران مدام
اس قدر جوشِ جنوں اور اس اعزاز کے ساتھ

خودی

ہے جس کو شوق اپنی خودی کی نمود کا
سچ پوچھیے تو اس کو خدا پر یقیں نہیں

رہِ معرفت میں جو رکھا قدم
خودی بھی بس اک نقشِ پا ہو گئی

خودی کی حس سے بھی ہوتا ہے انتشار اکبر
کہاں رہوں کہ مجھے بھی مرا پتا نہ چلے

شرک ہے اپنی خودی کا اگر آتا ہے خیال
کفر ہے جاں سے پیارا اگر اللہ نہ ہو

کعبہ

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا

خدااور صفاتِ خدا

صفاتِ حق تعالیٰ فہمِ منکر میں نہیں آتے
وہ کہتا ہے کہ گویا کچھ نہ ہونا ہے خدا ہونا
خدا ان سے ملائے تو نہایت خوش ہی آئے گا
نیا عہدِ وفا بندھنا گزشتہ کا گلا ہونا
طریقِ مغربی کی کیا یہی روشن ضمیری ہے
خدا کو بھول جانا اور محوِ ماسوا ہونا

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جاجا کے تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

کرتے ہو تم خوشامدِ دنیا بڑھا کے ہاتھ
اللہ کی طرف نہیں اٹھتے دعا کے ہاتھ

قرآن

شکر ہے راہِ ترقی میں اگر بڑھتے ہو
یہ تو بتلاؤ کہ قرآں بھی کبھی پڑھتے ہو

نماز

ٹٹوپہ جس طرح سے ہو تازی کا ساز بوجھ
یوں بابوانِ ہند پہ ہے اب نماز بوجھ

توبہ

فریاد کیے جا اے اکبر کچھ ہو ہی رہے گا آخرِ کار
اللہ سے توبہ ایک طرف صاحب کی دہائی ایک طرف

تہذیبوں کا تصادم۔۔۔اکبرالہ آبادی کی شہادتیں (۳)

سرسید

کھل گیا مجھ پر بہت ہیں آپ میرے خیر خواہ
خیر چندہ لیجیے طومار رہنے دیجیے

مذہب چھڑایا عشوۂ دنیا نے شیخ سے
دیکھی جو ریل اونٹ سے آخر اُتر پڑے

سید کی روشنی کو اللہ رکھے قائم
بتی بہت ہے موٹی روغن بہت ہی کم ہے

مسلمانوں کی خوشحالی کی بے شک دھن ہے سید کو
مگر یہ کام نکلے گا نہ لکچر سے نہ چندوں سے

سیّد اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسا نہ ملا

کر گئے تھے حضرت سید عقیدوں کو درست
چرخ نے رسموں کا بھی آخر صفایا کر دیا

ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

اشیاء

کم ہوئی آخر بصارت روشنی میں لیمپ کی
بڑھ گئی ہو کچھ بصیرت تو جلایا کر دیا

جیسی جسے ضرورت ویسی ہی اس کی چیزیں
یاں تخت ہے تو پھر کیا واں میز ہے تو پھر کیا

یہ پاس اور وہ باس نہ موجد نہ اہلِ زر
اخبار میں جو چھپ گئے ارماں نکل گیا

اگر وہ کہتے ہیں املی تو ہم کہیں گے یہی
ضرور کیا ہے کریں بحث جا کے آم سے ہم
چھڑی اٹھائی خموشی سے چل دیے اکبر
سفر میں رکھتے نہیں کام ٹیم ٹام سے ہم

ہمارا خنجر بھی بدنما ہے اور اُن کی سوئی بھی ہے وہ آفت
کہ صاف بھی ہے چمک بھی رکھتی ہے گول بھی ہے مہین بھی ہے
دعا کو بھی وہ کبھی ہے اٹھتا اسے ہے دن رات صرف چکر
خدا کی قدرت کے کارخانہ میں ہاتھ بھی ہے مشین بھی ہے

یہ کلاک اچھے سُروں میں تو بجا کرتی ہے
مفت پیدا ہوئی ہے آپ کو کیوں واچ کی دُھن

گو کہ اس میں ذرا ثقالت ہے
پھر بھی بسکٹ سے شیر مال اچھی

طرزِ فکر

موت سے ڈرتے ہیں اب پہلے یہ تعلیم نہ تھی
کچھ نہیں آتا تھا اللہ سے ڈرتے کے سوا

نہیں کچھ اس کی پرسش الفتِ اللہ کتنی ہے
یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

مسلم ہے مگر بات نبیؐ کی نہیں سنتا
لڑکا ہے مگر اپنے ولی کی نہیں سنتا
آنے والے نہ رہے انجمنِ دل کی طرف
کوئی کالج کی طرف ہے کوئی کونسل کی طرف

میں نے کہا کہ اب تو مسجد سے ہے مجھے کد
گرجا اُبھر کر بولا میں اس سے خوش ہوں بے حد
میں نے کہا مخالف تیرا بھی ہوں تو بولا
میری ہی پالیسی کی واحد ہے یہ ابجد

مغربی تہذیب کا اثر

اب شغلِ زندگی کے ہیں قانون ہی کچھ اور
کیسی غزل یہاں تو ہے مضمون ہی کچھ اور
وہ جادوئے سخن ہے نہ وہ رنگِ انجمن
تہذیبِ مغربی کے ہیں افسوں ہی کچھ اور

اتنی آزادی بھی غنیمت ہے
سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں

چُھوٹا اگر میں گردشِ تسبیح سے تو کیا
اب پڑ گیا ہوں آپ کی باتوں کے پھیر میں

پاؤں کانپا ہی کیے خوف سے ان کے در پر
چست پتلون پہننے پہ بھی پنڈلی نہ تنی

معنی کو بھلا دیتی ہے صورت ہے تو یہ ہے
نیچر بھی سبق سیکھ لے زینت ہے تو یہ ہے

اتنا ہی آدمی میں سمجھیے کمالِ فہم
جتنا کہ احتراز کرے وہ فضول سے

قتل سے پہلے ہے کلورا فارم
شکر ہے ان کی مہربانی کا

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

جس روشنی میں لوٹ ہی کی آپ کو سوجھے
تہذیب کی میں اس کو تجلی نہ کہوں گا
لاکھوں کو مٹا کر جو ہزاروں کو ابھارے
اس کو تو میں دنیا کی ترقی نہ کہوں گا

کمرے میں جو ہنستی ہوئی آئی مس رعنا
ٹیچر نے کہا علم کی آفت ہے تو یہ ہے
یہ بات تو اچھی ہے کہ الفت ہو مسوں میں
خود اُن کو سمجھتے ہیں قیامت ہے تو یہ ہے
پیچیدہ مسائل کے لیے جاتے ہیں انگلینڈ
زلفوں میں الجھ آتے ہیں شامت ہے تو یہ ہے
پبلک میں ذرا ہاتھ ملا لیجیے مجھ سے
صاحب مرے ایمان کی قیمت ہے تو یہ ہے

خطا معاف مروں گا میں حور ہی کے لیے
مسیں بھی خوب ہیں لیکن حضور ہی کے لیے

خلافِ شرع کوئی قصد ہو معاذ اللہ
شراب پیتا ہوں میں بس سرور ہی کے لیے

بازارِ مغربی کی ہوا سے خدا بچائے
میں کیا مہاجنوں کا دِوالا نکل گیا

(جاری ہے)

تہذیبوں کا تصادم۔۔۔اکبرالٰہ آبادی کی شہادتیں (۴)

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہو گی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے

بدل جائے گا اندازِ طبائع دور گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہوں گے

نہ پیدا ہو گی خطِ نسخ سے شانِ ادب آگیں
نہ نستعلیق حرف اس طور سے زیبِ رقم ہوں گے

خبر دیتی ہے تحریکِ ہوا تبدیلِ موسم کی
کھلیں گے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہوں گے

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے

بہت ہوں گے مغنّی نغمۂ تقلیدِ یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لیے بے تال و سم ہوں گے

ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہو گی

نغماتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے

بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے

گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے

کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہو گا نہ غم ہو گا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے

شیخ جی اپنی سی بکتے ہی رہے
وہ تھیٹر میں تھرکتے ہی رہے
دف بجایا ہی کیے مضموں نگار
وہ کمیٹی میں مٹکتے ہی رہے
سرکشوں نے طاعتِ حق چھوڑ دی
اہلِ سجدہ سر پٹکتے ہی رہے

موسیقی

شیخ کو وجد میں لائی ہیں پیانو کی گتیں
پیچ دستارِ فضیلت کے کھلے جاتے ہیں

موسیقی شراب و جوانی و حسن و ناز
بچتا ہے کون اور خدا بھی بچائے کیوں
غرب کی مدح بھی ہے شرق کی تحسین کے ساتھ
ہم پیانو بھی بجانے لگے اب بین کے ساتھ

اغراض

وفا میں ثابت قدم نکلنا فدائے عشقِ حبیب ہونا
یہ کامیابی ہے عاشقی کی یہی تو ہے خوش نصیب ہونا

اقبال

عطا ہوئی ہو اگر بصیرت تو ہے یہ حالتِ مقامِ حیرت
خدا سے اتنا بعید رہنا خودی سے اتنا قریب ہونا

شہرت اور تاریخ

رسولِ اکرمؐ کی ہسٹری کو پڑھو تو اول سے تا بہ آخر
وہ آپ ثابت کرے گی اپنا عظیم ہونا عجیب ہونا

معاشرت

نفس کے تابع ہوئے ایمان رخصت ہو گیا
وہ زنانے میں گھسے مہمان رخصت ہو گیا

علم اور تلوار

فرق ظاہر ہو گیا جب سے قلم اور تیغ کا
دل میں انشا کا جو تھا ارمان رخصت ہو گیا

حق اور عقل

حق سے اگر ہے غافل ہرگز نہیں ہے عاقل
ہسٹری جو ہے تو پھر کیا پرویز ہے تو پھر کیا

اخبار

یہ پاس اور وہ باس نہ موجد نہ اہلِ زر
اخبار میں جو چھپ گئے ارماں نکل گیا

جدید وقدیم

پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق اتنا ہے
اسے کشتی نہیں ملتی اسے ساحل نہیں ملتا
پہنچنا داد کو مظلوم کا مشکل ہی ہوتا ہے
کبھی قاضی نہیں ملتے کبھی قاتل نہیں ملتا

حکمت اور فلسفہ

کتابِ دل مجھے کافی ہے اکبر درسِ حکمت کو
میں اسپنسر سے مستغنی ہوں مجھ سے مل نہیں ملتا

(جاری ہے)

تہذیبوں کا تصادم ۔۔۔ اکبرالہ آبادی کی شہادتیں (۵)

جدید وقدیم

پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق اتنا ہے
اسے کشتی نہیں ملتی اسے ساحل نہیں ملتا
پہنچتا داد کو مظلوم کا مشکل ہی ہوتا ہے
کبھی قاضی نہیں ملتے کبھی قاتل نہیں ملتا

حکمت اور فلسفہ

کتابِ دل مجھے کافی ہے اکبر درسِ حکمت کو
میں اسپنسر سے مستغنی ہوں مجھ سے مل نہیں ملتا

نامۂ اعمال

آفیشل اعمال نامہ کی نہ ہو گی کچھ سند
حشر میں تو نامۂ اعمال دیکھا جائے گا

عقل اور حال

عالم فطرت پہ ہے میری نظر بھی اے حکیم
فرق یہ ہے تجھ کو عقل آئی مجھے حال آ گیا

اقبال

دعوئ علم و خرد میں جوش تھا اکبر کو رات
ہو گیا ساکت مگر جب ذکرِ اقبال آ گیا

شیخ اور کالج

شیخ درگور و قوم در کالج
رنگ ہے دورِ آسمانی کا

فلسفہ وسائنس

فلاسفی کو ہے مرغوب طبعِ الا اللہ
طریقِ سیفٹک کو ہے لا الہ پسند

سیاست

عزت ملی ہے شرکتِ کونسل کی شیخ کو
غازہ ملا گیا ہے رخِ فاقہ مست پر

نوکری اور کاروبار

کچھ صنعت و حرفت پہ بھی لازم ہے توجہ
آخر یہ گورنمنٹ پہ بھی لازم ہے توجہ

سول سروس

عزیزانِ وطن سوچیں سول سروس سے کیا حاصل
یگانوں میں رہو بیگانہ ہو کر اس سے کیا حاصل

فلسفہ

چلا ہے فلسفہ لے کر ہمیں سوئے ظلمات
بہت ہی تنگ ہیں اس اسپ بے لگام سے ہم
دلیلیں فلسفہ کو نورِ باطن کر نہیں سکتیں
کواکب کی شعاعیں رات کو دن کر نہیں سکتیں

خواتین

یہاں کی عورتوں کو علم کی پروا نہیں بے شک
مگر یہ شوہروں سے اپنے بے پروا نہیں ہوتیں

نغمہ سنجی سے بھی آتی تھی خواتین کو شرم
سازِ مغرب سے مگر ہو گئی اب ناچ کی دُھن

انگریز

شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہوں
میں تو انگریز ہی سے ڈرتا ہوں
آبرو چاہو اگر انگریز سے ڈرتے رہو
ناک رکھتے ہو تو تیغِ تیز سے ڈرتے رہو

خدا اور فلسفہ

نیشنل وقعت کے گم ہونے کا ہے اکبر کو غم
آفیشل عزت کا اس کو کچھ مزا ملتا نہیں

مشرقی و مغربی

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اُس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

دین اور نیچر

طلب کر دین سے اے محوِ نیچر جوش بامعنی
صدائیں مرغ کی کارِ موذّن کر نہیں سکتیں

انقلاب

اکبر ہمارے عہد کا اللہ رے انقلاب
گویا وہ آسماں نہیں وہ زمیں نہیں

تہذیب

بزرگوں سے عداوت دوستی بادہ فروشوں سے
اور اس پر مدعی تہذیب کے بن کر اکڑتے ہیں

تمہاری پالیسی کا حال کچھ کھلتا نہیں صاحب
ہماری پالیسی تو صاف ہے ایماں فروشی کی

خواہشِ زر میں نئی تہذیب کے پیرو بنے
وہ نہ ہاتھ آیا مگر گنجِ معائب ہو گئے

قرآن اور ڈارون

عوض قرآن کے اب ہے ڈارون کا ذکر یاروں میں
جہاں تھے حضرتِ آدم وہاں بندر اچھلتے ہیں

مسلمان

وزن اب اُن کا معیّن نہیں ہو سکتا کچھ
برف کی طرح مسلمان گھلے جاتے ہیں
داغ اب ان کی نظر میں ہیں شرافت کے نشاں
نئی تہذیب کی موجوں سے دُھلے جاتے ہیں

(جاری ہے)

تہذیبوں کا تصادم۔۔۔اکبرالہ آبادی کی شہادتیں (۶)

کلرکی

مذہب چھوڑو، ملّت چھوڑو، صورت بدلو، عمر گنواؤ
صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت توبہ توبہ

زبانِ اردو

فارسی اٹھ گئی اردو کی وہ عزت نہ رہی
ہے زباں منہ میں مگر اس کی وہ قوت نہ رہی

وجود، دلیل

مری ہستی ہے جو خود شاہد وجودِ ذاتِ باری کی
دلیل ایسی ہے یہ جو عمر بھر رد ہو نہیں سکتی

رسالت

مسلمانوں کو فیض اس بزم سے ممکن نہیں اکبر
کہ جس میں عزت نامِ محمدؐ ہو نہیں سکتی

تقدیر

کھوئے دیتے ہو جو تم مذہب و ملّت اے یار
کیا سمجھتے ہو کہ مل جائے گی تقدیر نئی

اسلام اور کفر

کفر کی رغبت بھی ہے دل میں بتوں کی چاہ بھی
کہتے جاتے ہیں مگر منہ سے معاذ اللہ بھی

شاعری

عشق کو دل میں دے جگہ اکبر
علم سے شاعری نہیں آتی

حضرتِ دل ہو گئے اس عہد میں جزوِ شکم
کیجیے عرضی نویسی شعر خوانی ہو چکی

عشق

عشق و مذہب میں دو رنگی ہو گئی
دین و دل میں خانہ جنگی ہو گئی

بل

قول بابو ہے کہ جب بل پیش ہو
پیشِ حاکم بلبلانا چاہیے

ٹیمز اور فرات

ٹیمز میں ممکن نہیں نظارۂ موجِ فرات
ایسی خواہش کو سمندر پار رہنے دیجیے

پانیر

گھر کے خط میں ہے کہ کل ہو گیا چہلم اس کا
پانیر لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے

غذا اور دوا

دوا ہے کالج اور کونسل سو اس کی ہے فراوانی
غذا ہے راحتِ دل اور دولت وہ بہت کم ہے

اسلام اور مغرب

روحانیت کے بدلے آنکھوں میں خاک ہے اب
اس میں وہی وہی تھا اس میں ہمیں ہمیں ہے

انگریز اور مسلمان

پھر اُٹھی ہے آپ کی تیغِ ستم
مجھ میں کیا باقی ابھی کچھ جان ہے
حکمِ خاموشی ہے اور میری زباں
آپ کی باتیں ہیں میرا کان ہے

منطق

ایسی منطق سے تو دیوانگی بہتر اکبرؔ
کہ جو خالق کی طرف دل کو جھکا ہی نہ سکے

اصول

معیّن ہی نہیں جن کے اصول و ماخذ اے اکبرؔ
قیامت تک وہ سرداری کے قابل ہو نہیں سکتے

تھیٹر

شیخ جی اپنی سی بکتے ہی رہے
وہ تھیٹر میں تھرکتے ہی رہے
دف بجایا ہی کیے مضموں نگار
وہ کمیٹی میں مٹکتے ہی رہے
سرکشوں نے طاعتِ حق چھوڑ دی
اہلِ سجدہ سر پٹکتے ہی رہے

فکرِ دنیا

طالبِ دنیا کو اکبر کس طرح سمجھوں میں خضر
خود جو گم ہے فکر میں وہ رہنما کیونکر ہوا

عقل

رہے نہ دل کے لیے کوئی مستقل مرکز
یہی ہے عقل تو دل اس سے دُور ہی اچھا

وحی، نبوت

یقیں خدا کا بتِ نکتہ چیں نے کیوں نہ کیا
نہ پوچھ کارِ نبی دوربیں نے کیوں نہ کیا

فکر

رہے نہ اہلِ بصیرت تو بے خرد چمکے
فروغِ نفس ہوا عقل کے زوال کے بعد

تہذیب

تہذیب کے خلاف ہے جو لائے راہ پر
اب شاعری وہ ہے جو ابھارے گناہ پر

معنی، لفظ، زبان

وہاں الفاظ خضرِ رہ ہیں یاں معنی ہیں منزل پر
زباں کا ان کو دعویٰ ہے تو مجھ کو ناز ہے دل پر

ترقی

مسجدیں چھوڑ کے جا بیٹھے ہیں میخانوں میں
واہ کیا جوشِ ترقی ہے مسلمانوں میں

تفسیر

کھل گیا مصحفِ رخسار بتانِ مغرب
ہو گئے شیخ جی بھی حاضرِ نئی تفسیر کے ساتھ

تعقل

اس مٹی کو دیکھ اکبر ذوقِ تعقل ہے
کہیں ٹہنی کہیں پتی کہیں غنچہ کہیں گل ہے

الحاد

وہی انساں وہی آنکھیں وہی جینا وہی مرنا
کہیں اللہ اکبر ہے کہیں الحاد کا غل ہے

جنوں

بنا ہوں شاہ بتوں کی خوش انتظامی سے
خدا بچائے مجھے ہوش کی غلامی سے

توحید و آخرت

جو ذکر آتا ہے آخرت کا تو آپ ہوتے ہیں صاف منکر
خدا کی نسبت بھی دیکھتا ہوں یقینِ رخصت گمان باقی

تجارت، نوکری

زوالِ قول کی تو ابتدا وہی تھی کہ جب
تجارت آپ نے کی ترک، نوکری کر لی

عبادت، مسجد

خیال کیا ہو کسی کو بنائے مسجد کا
کہ مسجدوں کو ضرورت ہے اب نمازی کی

انجن

میں تو انجن کی گلے بازی کا قائل ہو گیا
رہ گئے نغمے حدی خوانوں کے ایسی تان لی

ڈگری

قسمت کا نام لے کر اب بھی گلہ ہے جائز
لیکن اسی کو بی اے، ایم اے جو ہو چکا ہو

فکری اشیا

حکام پہ بم کے گولے ہیں اور مولویوں پر گالی ہے
کالج نے یہ کیسے سانچوں میں لڑکوں کی طبیعت ڈھالی ہے

تعلق

اُن سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

شاعر

مذہب کو شاعروں کے نہ پوچھیں جنابِ شیخ
جس وقت جو خیال ہے مذہب بھی ہے وہی

ذوق

ضعفِ مشرق نے تو رکھا پاؤں کو جھگڑا وہی
مغربی فکروں نے لیکن منہ کو انجن کر دیا
اللہ رے انقلابِ طرز و مذاقِ مشرق
حافظ کے شعر کیسے سب پڑھ رہے ہیں ریڈر

دیوبند

ہے دلِ روشن مثالِ دیوبند
اور ندوہ ہے زبانِ ہوشمند

عقیدہ علی گڑھ

ہاں علی گڑھ کی بھی تم تشبیہ لو
ایک معزز پیٹ بس اس کو کہو

مشرق ومغرب

لکھی ہے صحیح اک فرنگی نے یہ بات
مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق

قوم مذہب سے ہے

مغالطے میں پڑے ہیں ہمارے اہلِ وطن
کہ قوم کے لیے مذہب کا کوئی کام نہیں
قوام قوم کا مذہب ہی ہے زمانے میں
کہاں کی قوم جب اس کا کوئی قوام نہیں

(جاری ہے)

تہذیبوں کا تصادم ۔۔۔ اکبر الٰہ آبادی کی شہادتیں (۷)

اکبر الٰہ آبادی کی شاعری سے تہذیبوں کے امتیازات، عدم مطابقت اور تصادم کی مثالیں آپ نے ملاحظہ فرمائیں۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ یہ اکبر کی کلیات کا مکمل مطالعہ نہیں ہے۔ اتنی ہی شہادتیں ان کی شاعری سے مزید پیش کی جا سکتی ہیں مگر پھر لوگ اکبر کو پڑھتے پڑھتے بور ہو جائیں گے۔ اس لیے ہم چند مثالوں ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ لیکن مثالیں پیش کر کے رہ جانا بھی فی زمانہ خطرے سے خالی نہیں۔ ان کے معنی اور تاریخی و فکری پس منظر پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ آیئے موضوعات کے حوالے سے اکبر کی شاعری پر اپنے فہم کے مطابق کلیاتِ اکبر میں جال پھینک کر تہذیبی تصادم کی مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ اس کی ابتدا توحید، یعنی تصورِ خدا اور صفاتِ باری تعالیٰ کے معاملے سے کی جائے تو اچھا ہے۔ اکبر نے فرمایا:

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں، تری پہچان یہی ہے

جیسا کہ ظاہر ہے یہ شعر وجودِ خدا سے متعلق ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسا شعر جدید مغربی تہذیب کے فکری چیلنج سے قبل لکھا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی فکر کی تاریخ میں ظہورِ اسلام کے بعد کبھی ایسا مرحلہ نہیں آیا جب وجودِ خدا کے بارے میں یہ سوال اٹھا ہو کہ خدا ہے یا نہیں۔ مگر جدید مغربی فکر کے زیرِ اثر ہمارے یہاں یہ سوال کئی جہتوں کے ساتھ اٹھا اور مغربی فکر نے وجود باری تعالیٰ کو چیلنج کیا۔ اکبر نے اس چیلنج کی کئی بنیادی صورتوں کی صورت گری کی ہے۔ مثلاً:

خدا کی ہستی میں شبہ کرنا اور اپنی ہستی کو مان لینا
پھر اس پہ طرّہ اس اِدّعا کا کہ ہم ہیں اہلِ شعور ایسے

دنیا میں بے خبر ہے جو پروردگار سے
شاید ہے زندہ اپنے ہی وہ اختیار سے

یہ اسلام کے الٰہیاتی اصول یعنی Ontological Principle کی نفی تھی اور اکبر نے اس نفی کو نہ صرف یہ کہ اپنے شعور میں درج کیا بلکہ اعلیٰ تخلیقی سطح پر اس کا اظہار کیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جدید مغربی فکر اس حوالے سے کیا کہہ رہی تھی؟

وہ کہہ رہی تھی کہ اس کائنات میں خدا کا کوئی وجود نہیں۔ یہ سرتاپا ایک مادی کائنات ہے۔ مادہ شعور کا حامل ہے اور یہ کائنات خود اس کے صاحبِ شعور ہونے کی دلیل ہے۔ اس کا سوال تھا کہ خدا ہے تو ہمیں نظر کیوں نہیں آتا۔ ہمارا ذہن اس کا ادراک کیوں نہیں کر پاتا؟ آخر کروڑوں انسان اس کو دیکھنے اور سمجھنے سے کیوں قاصر ہیں۔ اکبر نے شعری سطح پر اس کے مختلف جوابات لکھے۔ مثلاً کہیں انھوں نے کہا کہ جو لوگ خدا کے منکر ہیں، وہ اسبات پر کیوں غور نہیں کرتے کہ کیا اس دنیا میں وہ اپنے اختیار سے زندہ ہیں؟ کیا یہ مظہر خدا کی ہستی کا ثبوت ہے، کہیں انھوں نے اس بات پر حیرت ظاہر کی ہے کہ انسان اپنی ہستی کو تو مان رہا ہے مگر اسے خیال نہیں آرہا کہ وہ خود بخود تو نہیں بن گیا، کیا اس کا کوئی بنانے والا نہیں ہے۔ بالآخر وہ اس مسئلے پر فلسفیانہ، فکری اور منطقی دلیل قائم کرتے ہیں کہ خدا دل میں تو آتا ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا اور یہی اس کی پہچان ہے اور یہ اکبر کی ذاتی اور شخصی رائے نہیں ہے۔ بلکہ انھوں نے وہی بات کہی ہے جو ان کی مذہبی فکر نے انھیں سکھائی ہے اور وہ یہ کہ غیب یا Unseen کے علم کا مرکز صرف قلب ہے۔ یہ باطن کی آنکھ ہے۔ اس کے لیے بصیرت کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسے ہمارے علماء اور صوفیائے کرام نے ''عقلِ کلی'' یا Intellect بھی کہا ہے۔ اس کے برعکس ذہنی عقل جزوی یا Reason کی علامت ہے۔ یہ عقل کی وہ قسم ہے جو تجزیے کے ذریعے علم حاصل کرتی ہے، اسی لیے یہ حقیقت کو ٹکڑوں میں بانٹ لیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا علم ٹکڑوں یا Fragments کا علم ہوتا ہے۔ کلیتاً یا Totality کا علم نہیں ہوتا۔ عقل کی یہ صورت خارجی حواس پر انحصار کرتی ہے اور حواس سے آگے اس کی رسائی نہیں۔ چنانچہ صرف ایک خارجی آنکھ ہے جو ظاہر کو دیکھ اور ایک حد

تک سمجھ سکتی ہے۔ لیکن مغربی تہذیب میں یہ مسئلہ پیدا کیوں ہوا؟ اس کا جواب اکبر نے صاف الفاظ میں دیا ہے اور اس پر گہرا طنز کیا ہے اور اس تفہیم کا مظاہرہ کیا ہے جو آج ۲۰۰۶ء میں بھی اچھے اچھوں کو فراہم نہیں۔ مگر اکبر کا جواب کیا ہے؟ آپ پڑھ چکے ہیں۔ اکبر نے کہا ہے:

منزلوں دوران کی دانش سے خدا کی ذات ہے

خورد بیں اور دور بیں تک ان کی بس اوقات ہے

اکبر نے اس شعر کے دوسرے مصرعے میں مغرب کی علمیاتی بنیادوں یعنی Epistimological Foundations کو بیان کر دیا ہے۔ یعنی اہلِ مغرب کی تہذیب یقینی علم کے سرچشمہ کے حوالے سے ''وحی'' کے بجائے جدید سائنس پر کھڑی ہے یعنی اس کی نہاد تجربی یا Empirical ہے۔ اس کا مطلب آسان زبان میں یہ ہے کہ جدید مغربی تہذیب صرف اس حقیقت کو مانتی ہے جو مشاہدے اور تجربے سے ثابت ہو سکتی ہو اور یہ مشاہدہ اور تجربہ بھی سائنسی آلات کی مدد سے کیا گیا ہو۔ چنانچہ اکبر نے کہا یہ ہے کہ وہ لوگ بھلا خدا کی ذات کو کیا سمجھیں گے جن کی اوقات خورد بین اور دور بین تک محدود ہو۔

جیسا کہ ظاہر ہے دور بین کائناتِ اکبر یا Macro World کے مشاہدے کے لیے بروئے کار آتی ہے اور خورد بین کائناتِ اصغر یا Micro World کے مشاہدے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ لیکن یہ ہے اپنی نہاد میں ''ظاہر کا مطالعہ'' غائب یا غیب کے مطالعے کے لیے اور طرح کے آلات استعمال میں آتے ہیں اور ان آلات کی جدید مغربی تہذیب کو ہوا تک نہیں لگی۔ یاد رہے کہ اکبر دونوں تہذیبوں کے بنیادی اصولوں کو اس وقت ٹکرا کر دیکھ رہے تھے جب ہن ٹنگٹن کے پیدا ہونے میں ابھی ۵۰ سال کی دیر تھی۔ (جاری ہے)

تہذیبوں کا تصادم۔۔۔اکبرالٰہ آبادی کی شہادتیں (۸)

اکبر کی شاعری کے حوالے سے جب بات اسلامی تہذیب اور جدید مغربی تہذیب کی علمیاتی بنیادوں یا Epistimology تک آ گئی ہے تو اکبر کے کچھ شعروں پر دوبارہ نظر ڈال لینا یقیناً باعث ثواب ہوگا، فرماتے ہیں:

مذہب کبھی سائنس کو سجدہ نہ کرے گا
انسان اُڑیں بھی تو خدا ہو نہیں سکتے

علومِ دنیوی کے بحر میں غوطے لگانے سے
زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

جدید سائنس مغربی تہذیب کا عظیم ترین تہذیبی مظہر ہے اور اس مظہر نے ہمارے زمانے میں مذہب کو اس طرح چیلنج کیا ہے کہ مذہب یا تو یکسر فنا ہو جائے یا پھر جدید مغربی سائنس کے مفروضوں اور نظریوں پر ایمان لے آئے۔ اس کے درمیان کی کوئی صورت موجود نہیں تھی۔ اسی لیے اکبر کو کہنا پڑا کہ 'مذہب کبھی سائنس کو سجدہ نہ کرے گا'۔ ان کے شعر کا مصرعۂ ثانی اس سے بھی زیادہ اہم، دلچسپ اور معنی خیز ہے۔

جدید سائنس کا ایک مظہر ٹیکنالوجی بھی ہے۔ اور اس شعبے میں مغربی انسان نے ایسی ترقی کی ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ انسان جہازوں کی صورت میں پرندوں کی طرح اڑنے میں کامیاب رہا اور اس سے بھی اہم بات یہ ہوئی کہ اس اہلیت کو "شرفِ انسانی" بنا دیا گیا۔ لیکن کیا پرندوں کی طرح اڑنا شرفِ انسانی ہے؟ دنیا میں موجودات کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱) جمادات (۲) نباتات (۳) حیوانات (۴) انسان

اور مذہبی فکر کے مطابق انسان کا شرف نہ جمادات کی طرح ہونے میں ہے، نہ نباتات کی طرح ہونے میں۔ اس کا شرف نہ حیوانات کا مثیل ہونا ہے، نہ درندہ، چرندہ اور پرندہ ہونا۔ بلکہ اس کا شرف تو فرشتہ ہونا بھی نہیں ہے کیونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ لیکن ٹیکنالوجی نے جو مہارتیں پیدا کی ہیں اور ان کی بنیاد پر کہیں جمادات کی سی سختی اور تنگ دلی اور کہیں حیوانات کی سی وحشیانہ طاقت اور پرندوں کی طرح اڑنے اور آبی حیوانات کی طرح زیرِ آب رہنے کی جو صلاحیت انسان نے حاصل کرلی ہے، اس کی بنیاد پر اترانا شرفِ انسانی کے مطابق نہیں، اس کے صریحاً خلاف ہے۔ اسی لیے اقبال نے کہا ہے:

مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

ہمارے یہاں ایسے ''معصومین'' کی کوئی کمی نہیں جو کم وبیش چار سو سال کی مذہب و سائنس کی کشمکش اور اس حوالے سے وسیع علمی سرمائے کی موجودگی کے باوجود ابھی تک یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد یا تصادم نہیں۔ ہمیں یہاں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ایسے لاعلم مسلمان اسلام کے لیے کافروں اور مشرکوں سے زیادہ خطرناک ہیں، اگر وہ خدانخواستہ دانش ور وغیرہ ہوں تو ان پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ بیچارے سطح کو دیکھتے ہیں اور مذہب اور سائنس کی Epistimology کو نہیں دیکھتے۔ حالانکہ ایک کی Epistimology صرف ''وحی'' ہے اور دوسرے کی تجربیت یا Empiricism۔ چنانچہ اس سلسلے میں اکبر کا یہ شعر بھی معرکہ آراء ہے:

بڑھ رہا ہے کفر زلفِ علّت و معلول سے
بے زباں ہے بزمِ دل میں شمعِ ایمان اِن دنوں

جیسا کہ ظاہر ہے علّت و معلوم یا Cause and Effect جدید سائنس کا ایک بنیادی اصول ہے، اور اس اصول کے دائرے میں علت و معلول کا سلسلہ یا قوانینِ فطرت ہی سب کچھ ہو جاتے ہیں اور انہی سے پوری کائنات کی توجیہ ہو جاتی ہے اور زندگی اور کائنات کے لیے کسی خدا کی ''ضرورت'' باقی نہیں رہتی۔ اکبر نے اپنے مصرعۂ اولیٰ میں یہی بات پوری تخلیقی قوت کے

ساتھ کہی ہے۔ اردو شاعری میں محبوب کی زلف جس طرح کی اسیری پیدا کرتی ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ چنانچہ اکبر جب ''زلفِ علت و معلول'' کی ترکیب وضع کرتے ہیں تو وہ علت و معلول کے خالص سائنسی تجربے میں بھی شعریت بھر دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ خدا کے انکار کے لیے یہ کہنا اب ضروری نہیں رہا کہ خدا نہیں ہے بلکہ اس کے لیے علت و معلول کے نظریے پر ایمان لے آنا کافی ہے، اس کے بعد خدا از خود کائنات سے بے دخل ہو جاتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اکبر کی اس شاعری میں جسے مزاحیہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے، کس بلا کی فلسفیانہ اور مفکرانہ گہرائی ہے اور اس حوالے سے اکبر کے اس شعر کے بھی کیا کہنے:

علومِ دنیوی کے بحر میں غوطے لگانے سے
زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

یہاں ''زباں گو صاف ہو جاتی ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ ان علوم سے انسان قیل و قال سیکھ لیتا ہے۔ عوامی زبان میں بات کی جائے تو کہا جائے گا کہ اسے بک بک کرنا خوب آ جاتا ہے۔ اس سطح کو مزید پستی میں دیکھنا ہو تو کہا جائے گا کہ وہ گفتگو آلودگی یا Noise Pollution پیدا کرنا خوب سیکھ جاتا ہے۔ تاہم صفائے قلب کی نعمت اسے بہر حال حاصل نہیں ہوتی، اس لیے کہ ان علوم کا باطن سے کوئی علاقہ ہی نہیں۔ چنانچہ بقول شاعر:

کچھ نہ کہنے کے لیے
چلتی رہتی ہے زباں

(جاری ہے)

تہذیبوں کا تصادم ۔۔۔اکبرالہ آبادی کی شہادتیں (۹)

مغربی فکر کے زیرِ اثر ہمارا تصورِ انسانی، تصورِ تخلیق اور تصورِ تعلیم بدل کر رہ گیا۔ یہ معمولی تبدیلی نہیں تھی اور اس کے تحت ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہونے والے تھے۔ اکبر نے بے پناہ ذہانت کے ساتھ ان تغیرات کو تخلیقی سطح پر ریکارڈ کر کے انھیں معاشرے کے حافظے کا حصہ بنانے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں اکبر کے چند پڑھے ہوئے اشعار ایک بار پھر پڑھ لیجیے:

نئی تعلیم کو کیا واسطہ آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرتِ آدمؑ سے کیا مطلب
نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یوں ہے کہ گویا آبِ زم زم مے میں داخل ہے
نقص تعلیم سے اب اس کی سمجھ نہ رہی
دل تو بڑھ جاتا ہے اجداد کے افسانے سے
شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

ڈارون کا تصورِ ارتقاء انسانی تاریخ میں انسان کے الوہی تصور کے خلاف سب سے بڑی سازش تھی۔ ڈارون کا تصورِ ارتقاء اگرچہ ایک سائنسی مفروضہ تھا لیکن اس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک نظریے اور بالآخر ایک عقیدے کی حیثیت حاصل کر لی۔ مفروضے اور عقیدے میں جو فرق ہے، وہ ظاہر ہے۔ لیکن اس فرق پر غور کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا۔ مغربی سائنس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ حالانکہ اس سے بہتر تو یونان کی دیومالا تھی جس میں انسان کا وجود فرضی "GODS" کا مرہونِ منت تھا۔ عیسائیت نے حضرت عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دے کر ایک

بہت ہی بڑے شرک کا ارتکاب کیا لیکن یہ شرک بھی ڈارون کے ''سائنس فکشن'' سے بہتر تھا۔ اس لیے کہ یہاں کم از کم انسان بندر کی ارتقائی شکل تو نہیں تھا۔ اس سے بڑی خدا اور انسان کی تحقیر ممکن نہیں تھی لیکن جدید سائنس کا رعب ایسا تھا کہ کسی کو اس کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ ہوئی اور ڈارون کا تصورِ ارتقاء صرف مغرب میں نہیں، پوری دنیا میں عام ہو گیا اور نصابِ تعلیم اس کے عام ہونے کا سب سے بڑا ذریعہ بنا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈارون کے مفروضے میں پہلے دن سے بڑے بڑے منطقی اور سائنسی خلا موجود تھے۔ انھیں خود تصورِ ارتقاء کے عاشقوں نے Missing Links یا گمشدہ کڑیوں کا نام دیا لیکن ان کڑیوں پر غور کرنے کے بجائے کروڑوں انسان اس خیال کے قائل ہو گئے کہ آج نہیں تو کل ان کڑیوں کا سراغ اور ثبوت مل ہی جائے گا۔ لیکن یہ شہادتیں تصورِ ارتقاء کو کبھی بھی فراہم نہیں ہو سکیں اور گمشدہ کڑیاں آج بھی گمشدہ ہی ہیں لیکن اس عقیدے کے پرستاروں کے ''جوشِ ایمانی'' کا یہ عالم ہوا کہ انھوں نے اسے ثابت کرنے کے لیے جھوٹ بولنے اور غلط شہادتیں پیش کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسلام کیا دوسرے مذاہب بھی جدید مغرب کے اس رذیل علمی تحفے کو قبول نہیں کر سکتے تھے لیکن اس تصورِ نے دنیا بھر میں جو بے عقیدگی پیدا کی، وہ سامنے کی بات ہے۔ خود مسلمانوں میں ایسے لاکھوں افراد موجود ہیں جنہوں نے ڈارون کے اس تصور کے لیے مذہبی توجیہات وضع کیں، بعض تو اس سلسلے میں اس حد تک گئے کہ قرآن و حدیث سے اس کے لیے جواز تلاش کر لائے۔ کئی عرب مصنفین کی ایسی کتب ہماری نظر سے گزری ہیں جن میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ ڈارون تو بڑا پھسڈی تھا، اس سے چھ سو سات سو سال قبل مولانا روم ارتقاء کا تصور پیش کر چکے تھے۔ اس ضمن میں مولانا کے وہ اشعار کوڈ کیے گئے جن میں مولانا نے انسان کے روحانی، نفسیاتی یا شعور کے ارتقاء کے بارے میں گفتگو کی ہے اور کہا ہے کہ ایک وقت تھا کہ میری حالت حیوانوں جیسی تھی اور اس سے قبل میں گویا نباتات کی سطح پر تھا اور اس سے قبل جمادات کی سطح میرا حال تھی۔ پاکستان کے ایک مذہبی اسکالر نے حال ہی میں ایک ٹی وی

پروگرام میں صاف کہا کہ ہوسکتا ہے کہ انسان کا ابتدائی وجود ایک جرثومے کی صورت میں ہو۔ ہم نے اس پر کالم لکھا تو وہ اپنے بیان سے مکر گئے اور ایک طویل مضمون میں فرمایا کہ انھوں نے جو کہا ہے اسے غلط سلط سمجھا گیا ہے۔ بہرحال اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس تصور نے مسلم معاشروں پر کتنے گہرے اور دور رس اثرات مرتب کیے ہیں۔ اکبر کا کمال یہ ہے کہ جب ہم انگریزوں کے غلام بن چکے تھے اور غلامی نے سرسید جیسی مجہول فکر اور شخصیات پیدا کرنی شروع کر دی تھیں، انھوں نے مغرب اور اسلام کی ایک ایک عدم مطابقت اور آویزش کی ایک ایک صورت کو پہچانا اور مسلمانوں کو بتایا کہ اسلام کا تصورِ انسان یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے انسان تخلیق کیا اور اس تصور کا جناب ڈارون کے سائنسی افسانے سے کوئی تعلق نہیں۔

جدید مغربی تہذیب نے تعلیم اور تصورِ تعلیم پر جو اثرات مرتب کیے، اکبر کے شعور نے ان کو بھی پہچانا اور ان پر بھی ردِعمل ظاہر کیا۔ جدید مغربی تہذیب کے اثر سے قبل ہماری تعلیم اچھی تھی یا بری تھی لیکن اس کی نہاد مذہبی تھی۔ لیکن نئی تعلیم نے نہاد کو بدل ڈالا اور مذہب کی جگہ سیکولر طرزِ فکر نے لے لی، البتہ مذہب کو ایک لیبل کے طور پر باقی رکھا۔ یہی شراب میں آبِ زم زم ملانے کا عمل تھا اور یہیں سے سرسید کی وہ ذہنیت پیدا ہو رہی تھی جو ہمیں بتا رہی تھی کہ تمہارے پرانے نظامِ تعلیم میں اجداد کے افسانوں کے سوا تھا ہی کیا؟ علم تو یہ ہے کہ جو انگریز لے کر آئے ہیں۔ یہ کہنا تو دشوار ہے کہ یہ صاحب ڈارون کے کتنے قائل تھے لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ سرسید کے نظامِ تعلیم نے ہمیں بندروں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ انگریز انھیں Baboon کہتے تھے لیکن انھوں نے ازراہِ عنایت اس لفظ سے حرف "N" خارج کر دیا اور ہماری زبان کو ایک نیا لفظ فراہم ہوا۔ یعنی ''بابو'' آج بھی ہم پر مسلط ہیں اور ان کی ایک قسم سوال کرتی ہے، تہذیبوں کا تصادم کہاں ہے؟؟

(جاری ہے)

تہذیبوں کا تصادم اور اکبرالہ آبادی کی شہادتیں (۱۰)

اکبرالہ آبادی یقیناً افسانہ نگار نہیں تھے لیکن ان کی شاعری میں مکمل افسانے بکھرے پڑے ہیں، ایک افسانہ سنیے:

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

ان دو مصرعوں میں افسانے کا پورا پلاٹ موجود ہے۔ دو کردار ہیں جن کی ایک ابتدا ہے جو بیان میں آئے بغیر بیان ہوگئی ہے۔ ایک انتہا ہے جس میں ڈرامے سے زیادہ ڈرامائیت ہے۔ یہ ڈرامائیت اقبال کے یہاں بہت زیادہ ہے، میر، غالب اور دیگر اچھے شعراء کے شعروں میں بھی اس کی جھلکیاں مل جاتی ہیں لیکن اقبال کے سوا یہ ڈرامائی عنصر اگر کہیں وافر مقدار میں ملتا ہے تو وہ اکبر کی شاعری ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے جو کہ ادب کے نوبل انعام یافتہ تھے، بڑے شاعر کی ایک تعریف یہ کی ہے کہ وہ پوری زندگی کے ست کو ایک لمحے میں سمیٹ کر بیان کر دے۔ اکبر کے مذکورہ شعر میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس میں زندگی کا ست تفسیر سمیت در آیا ہے اور گہرے افسانوی رنگ کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ تفسیر اس تہذیبی تصادم کے سوا کچھ نہیں تھی۔ بظاہر تو اتنی سی بات ہے کہ میاں گھر آیا تو بیگم صاحبہ نے اسکول کے معاملات پر گفتگو شروع کر دی اور رات کا کھانا "Serve" کرنا بھول گئیں۔ لیکن معاف کیجیے گا برصغیر یا اسلامی معاشرت میں رونما ہونے والی یہ ایک بہت بڑی تہذیبی تبدیلی تھی جسے اکبر نے طرزِ احساس کی تفسیر کے حوالے سے بیان کیا۔

اس معاشرت میں مرد اور عورت کے کردار طے شدہ تھے۔ مرد کے سر پر نان نفقے کا ذمہ تھا اور خواتین کی ذمہ داری گھر سے عبارت تھی۔ اس گھر میں بچوں اور خود شوہر کی دیکھ بھال سرفہرست تھی اور کھانے کے ادب و آداب یہاں تک برتے جاتے تھے کہ خواتین مردوں سے

پہلے کھانا نہیں کھاتی تھیں اور اگر مرد دیر سے گھر لوٹتے تھے تو بیویوں کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ ان کے کھانے کا بندوبست کریں۔

بیچارے اکبر اپنے زمانے میں ہی نہیں بعد ازاں بھی یہ طعنہ سنتے رہے کہ وہ ترقی کے خلاف ہیں۔ روشن خیالی کے دشمن ہیں اور رجعت پسندی نے انھیں گھیر لیا ہے۔ لیکن اکبر اس شعر میں اس بات پر معترض نہیں ہیں کہ خواتین نے نوکری کیوں کر لی، ان کا شکوہ یہ ہے کہ نوکری نے خواتین کو اتنا متوجہ کر لیا ہے کہ وہ شوہر کو رات کا کھانا کھلانا بلکہ یہ بتانا بھی بھول گئی ہیں کہ رات کا کھانا کہاں رکھا ہوا ہے۔ تجزیہ کیا جائے تو یہ پورے معاشرتی تجربے کی تبدیلی کا بیان ہے اور یہ تبدیلی خود بخود نہیں رونما ہو گئی تھی، اس کی وجہ مغربی فکر اور اس کے معاشرتی سانچے تھے جن میں ترجیحات کی فہرست تبدیل ہو گئی تھی۔ اس فہرست میں جہاں کبھی شوہر کا مقام تھا، وہاں معاشرتی کردار، شہرت، عزت اور دولت آ کھڑی ہوئی تھی اور اتنی اہم ہو گئی تھی کہ اس پر اس طرح مگن ہو کر گفتگو کی جا سکے کہ شوہر یاد ہی نہ رہے۔

اب آپ اس خاکے میں مزید رنگ بھر لیجیے اور فرض کر لیجیے کہ ''ان کی بیوی'' نے اسکول کی کیا کیا باتیں کی ہوں گی؟

اکبر کی زندگی میں یہ تجربہ اپنی ابتدائی شکل میں موجود تھا اور اکبر کو اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ آگے چل کر یہ تجربہ کیا کیا شکل اختیار کرنے والا ہے۔ تاہم اس کے باوجود انھوں نے طرزِ احساس کی اس تبدیلی کو پوری شدت سے محسوس اور بیان کیا۔ آج ہم اس تجربے سے بہت آگے کھڑے ہیں اور بسا اوقات لگتا ہے کہ ہم مغرب کے تجربے سے بہت دور نہیں رہ گئے ہیں مگر اس کے باوجود بھی بعض لوگ کہتے ہیں کہ تہذیبوں کا تصادم نہ کبھی تھا نہ کہیں ہے۔

(جاری ہے)

تہذیبوں کا تصادم اور اکبر الٰہ آبادی کی شہادتیں (۱۱)

اکبر نے اسلامی اور مغربی تہذیب کی عدم مطابقت شاعری اور ذرائع ابلاغ کیا، اشیاء تک میں دکھادی ہے۔ شاعری پر ان کے دو شعر ملاحظہ کیجیے، فرماتے ہیں:

عشق کو دل میں دے جگہ اکبر
علم سے شاعری نہیں آتی
خدمتِ دل ہو گئے اس عہد میں جزوِ شکم
کیجیے عرضی نویسی شعر خوانی ہو چکی

انگریز برصغیر میں توپ اور فلسفہ ہی نہیں، ایک نیا تصورِ شعر بھی لے کر آئے۔ اس تصورِ کو عرفِ عام میں ''فطرت نگاری'' کہا جاتا ہے۔ سرسید، حالی اور ان کے ہمنواؤں کو یہاں بھی پہلی نظر کا عشق لاحق ہوگیا۔ چنانچہ مولانا حالی تو فوراً ہی مقدمہ شعروشاعری لکھنے بیٹھ گئے جس میں انھوں نے مغرب کے شعری معیارات کی دل کھول کر داد دی اور اپنی شاعری کے بڑے حصے پر لعنت بھیجی۔ فرمایا:

یہ اردو قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر

سرسید نے اپنی تفسیر میں پروٹسٹنٹ ذہنیت کا مظاہرہ کیا اور مولانا حالی نے ادب میں۔ نتیجہ بہرحال دونوں کا ''بے ادبی'' نکلا۔ مجنوں گورکھ پوری نے کہیں لکھا ہے کہ ادب میں ارتداد کی دو افسوسناک مثالیں ہیں۔ ایک ٹالسٹائی اور دوسرے مولانا حالی۔ اس پر سلیم احمد نے یہ اضافہ کیا ہے کہ حالی کا ارتداد ٹالسٹائی سے زیادہ بنیادی ہے۔ جن لوگوں کو اس مسئلے کی تفصیل دیکھنی ہو، ان کے لیے محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کی تحریروں کا مطالعہ ناگزیر ہے کہ ان صاحبان نے حالی کا روحانی، نفسیاتی اور اخلاقی ڈی این اے تک بیان کردیا ہے۔ حالی پر عسکری صاحب کا مضمون بھا!

مانس غزل گو تو تنقید کا شاہکار ہے۔ قلم توڑنے کی اصطلاح استعمال تو کی جاتی ہے مگر اس کی مثالیں نایاب ہیں لیکن عسکری صاحب نے اس مضمون میں واقعتاً قلم توڑ دیا ہے۔

بہر حال حالی کے زیر اثر اردو شاعری میں فطرت پرستی کا رجحان پیدا ہوا اور شاعری کا مرکز باطن سے خارج میں منتقل ہو گیا۔ اکبر کے مصرع ''علم سے شاعری نہیں آتی'' کا مفہوم یہی ہے۔ ورنہ ہماری شعری روایت تو خود علم کی اعلیٰ ترین شکلوں سے منسلک ہے۔ خود حالی بڑے غزل گو تھے اور ان کی شاعری میں انسانی نفس کی گہرائیوں کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ قد کوتاہ اکبر نے اس بہت بڑی تہذیبی تبدیلی کو بھی شدت کے ساتھ محسوس اور بیان کیا اور نہ صرف یہ بلکہ اس کا تجزیہ بھی کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اس تفسیر کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ:

حضرتِ دل ہو گئے اس عہد میں جزوِ شکم

یعنی ہماری زندگی میں معاش کو بنیادی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہاں تک کہ دل بھی پیٹ کی توسیع بن گیا ہے اور یہ تبدیلی جیسا کہ ظاہر ہے مغرب کی تہذیبی یلغار اور اس کے مقابلے پر مسلم شعور کی پسپائی کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے طنز اور ملال کے ملے جلے لہجے میں کہا ہے:

کیجیے عرضی نویسی شعر خوانی ہو چکی

بعد ازاں اقبال کی شاعری میں یہی مسئلہ طرح طرح سے ظاہر ہوا۔ مثلاً:

فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟

اکبر الہ آبادی کا تہذیبی آویزش میں ڈوبا ہوا ایک اور معرکتہ الآراء شعر ہے:

گھر کے خط میں ہے کہ کل ہو گیا چہلم اس کا
پانیر لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے

اب آپ آخری مصرعہ کو ایک لفظ کی تبدیلی کے ساتھ بدل بدل کر لکھ سکتے ہیں۔ مثلاً:

جنگ لکھتا ہے کہ بیمار کا حال اچھا ہے
ڈان لکھتا ہے کہ بیمار کا حال اچھا ہے

فوکس کہتا ہے کہ بیمار کا حال اچھا ہے
بی بی سی کہتا ہے کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اکبر کے یہاں گھر کا خط ''امرِ واقعہ'' ہے، ایک واردات ہے، ایک ماجرا ہے اور پانیر محض ایک پروپیگنڈا۔ یہاں خط ہماری تہذیب کی علامت ہے اور پانیر مغربی تہذیب کی۔ مغربی تہذیب نے پروپیگنڈے کو جس طرح آرٹ بنایا وہ ہمارے سامنے ہے مگر اکبر کی تہذیبی حس ڈیڑھ سو سال پہلے اس امتیاز کو ریکارڈ کر رہی تھی اور وہ بھی اعلیٰ تخلیقی اور علامتی سطح پر۔ یہاں اخبار سے متعلق اکبر کا ایک اور غیر معمولی شعر پھر پڑھ لیجیے۔ فرماتے ہیں:

یہ پاس اور وہ پاس نہ موجد نہ اہل زر
اخبار میں جو چھپ گئے ارماں نکل گیا

اکبر کا کہنا ہے کہ اخبار میں خبر یا کسی تحریر کی اشاعت ہم مقامیوں کی اہلیت وصلاحیت کا پردہ اور مداوا بن گئی ہے۔ یہ اتنا گہرا نفسیاتی نکتہ ہے کہ ہم نے اسے سمجھ لیا تو آج ہمارے اخبارات میں جعلی دانش وروں اور مصنوعی کالم نویسوں کی بھرمار نہ ہوتی اور اگر ہوتی تو ان کی گرہ میں کچھ نہ کچھ ہوتا اور لوگ بیساکھیوں پر یہ کہہ کر بھنگڑا نہ ڈالتے کہ ہماری چار ٹانگیں ہیں۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں۔ اکبر نے تہذیبی امتیازات اشیاء تک میں دکھا دیے ہیں، مثلاً:

ہمارا خنجر بھی بدنما ہے اور ان کی سوئی بھی ہے وہ آفت
کہ صاف بھی ہے، چمک بھی رکھتی ہے، گول بھی ہے، مہین بھی ہے

گو کہ اس میں ذرا ثقالت ہے
پھر بھی بسکٹ سے شیرمال اچھی

غرب کی مدح بھی ہے شرق کی تحسین کے ساتھ
ہم پیانو بھی بجانے لگے اب بین کے ساتھ

اور اکبر صرف فرق ظاہر کر کے نہیں رہ جاتے، وہ اس کی وجہ بھی بتا دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

جیسی جسے ضرورت ویسی ہی اس کی چیزیں
یاں تخت ہے تو پھر کیا واں میز ہے تو پھر کیا

اکبر کے شعروں پر گفتگو کم از کم ایک سال جاری رہ سکتی ہے لیکن ابھی ہمیں اقبال اور مولانا مودودیؒ کے یہاں سے تہذیبی تصادم برآمد کرنا ہے۔ چنانچہ ہم اکبر کے سلسلے میں ۱۱ قسطوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ البتہ چلتے چلتے تہذیبی تصادم کے کم فہم منکروں کا بنیادی مسئلہ بھی اکبر کے ذریعے نمایاں کردیتے ہیں:

کفر کی رغبت بھی ہے دل میں بتوں کی چاہ بھی
کہتے جاتے ہیں مگر منہ سے معاذ اللہ بھی

تہذیبوں کا تصادم اور فکرِ اقبال

علامہ اقبال ہماری عصری تاریخ کی عظیم ترین شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی عظمت ایسی ہے کہ انھیں ہم صدیوں کے تہذیبی عمل کا حاصل کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ان کی عہد ساز شاعری ہمارے اجتماعی شعور کی صورت گر اور پیش گوئی کی اس غیر معمولی صلاحیت کی حامل ہے جس کے بغیر بڑی شاعری کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کی اصل فکر اس شاعری میں ملتی ہے۔ مذہبی، تاریخی اور تہذیبی حوالے سے اقبال کی فکر کا سب ۔سے اہم پہلو مغرب کی تنقید ہے اور یہ تنقید ایک عہد کا حوالہ ہے۔ اکبرالہ آبادی کے بعد اقبال ہما، ے دوسرے شاعر ہیں جن کے یہاں مشرق و مغرب کی آویزش اور اسلامی و جدید مغربی تہذیب کے اساسی تصورات ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو کر ایک دوسرے کی تعریف متعین کرتے نظر آتے ہیں۔ اس اعتبار سے اقبال ہمارے پہلے مفکر ہیں جنھوں نے مغرب کے فکری چیلنج سے صرفِ نظر کرنے کے بجائے پوری شدت سے اس کا جواب دیا۔

اقبال کے سامنے اصل سوال یہ تھا کہ مغربی فکر سے ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اقبال کی پوری زندگی شاعری اور نثر میں اس سوال کا جواب دینے میں بسر ہوگئی۔ اقبال کے جواب سے کسی کو اتفاق ہو یا اختلاف، لیکن یہ جواب اتنا اہم ہے کہ اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہماری گرہ میں صرف اکبر کی وہ شاعری رہ جائے گی جسے ہم میں سے اکثر اپنے جہل مرکب کے باعث مزاحیہ شاعری سمجھتے ہیں۔ اکبر کو بھی ایک طرف رکھ دیا جائے تو دو صدیوں کا گونگا پن ہمارے تعاقب میں ہوگا۔

اگرچہ اقبال کی پوری اردو کلیات اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے اساسی تصورات کے سوازنے سے بھری پڑی ہے لیکن اس سلسلے میں اقبال کے شعری مجموعے "ضربِ کلیم" کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ شعری مجموعہ کیا ہے، مغربی مفکر کی گردن پر رکھی ہوئی تلوار ہے اور

اس کے ہر صفحے پر تہذیبوں کا تصادم جاری نظر آتا ہے، مگر اس سلسلے میں اقبال کے جوش و جذبے کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ اقبال نے ضربِ کلیم کے پہلے صفحے پر مجموعے کے نام کے نیچے یہ فقرہ لکھنا ضروری سمجھا:

''یعنی اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف''

یہاں ہم تہذیبوں کے تصادم کو رو رہے ہیں اور وہاں اقبال جنگ کا اعلان کر رہے ہیں۔ تصادم جنگ کے مقابلے میں چھوٹی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ عہدِ حاضر میں صرف مغربی تہذیب ہی سانس نہیں لے رہی، دنیا کی دوسری تہذیبیں بھی موجود تھیں، مگر چونکہ مغربی تہذیب ہی عصر کا تعین کر رہی تھی، اس لیے عصرِ حاضر سے اقبال کی مراد صرف مغربی تہذیب اور اس کا پیدا کیا ہوا عہد تھا۔

بظاہر اقبال نے ضربِ کلیم کے پہلے صفحے پر صرف ایک فقرے میں اعلانِ جنگ کیا ہے۔ لیکن اس ایک فقرے کی اہمیت بھی غیر معمولی ہے۔ اس لیے کہ یہ اقبال جیسی شخصیت کا فقرہ ہے کسی ''شوقیہ فنکار'' کی کارستانی نہیں۔ لیکن اقبال نے یہ فقرہ لکھنا کیوں ضروری سمجھا جبکہ ضربِ کلیم کے اندرونی صفحات مغرب کی تنقید سے بھرے ہوئے تھے؟ اس کا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ اقبال قاری کے شعور کو پہلے صفحے سے اس جنگ کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے جو ان کے نزدیک اُمتِ مسلمہ کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھی۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو اقبال نے اس فقرے کو ''طبلِ جنگ'' کے طور پر برتا ہے۔

چونکہ اقبال کے یہاں تہذیبوں کے تصادم کا مطالعہ شروع ہو چکا ہے، اس لیے جن لوگوں کا تہذیبی و تاریخی حافظہ کچھ کمزور ہے، انھیں ایک بار پھر یہ یاد دلا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اقبال کے یہاں یہ تہذیبی تصادم سیموئل ہن ٹنگٹن کے نام نہاد 'Clash of Civilization' فوکویاما کے 'The end of the History'، امریکا کے Neo Cons اور گیارہ ستمبر سے بہت پہلے کی بات ہے۔ یہ چیزیں بیسویں صدی کے اواخر میں ظہور پذیر ہوئیں اور اقبال کی شاعری بیسویں صدی کے اوائل کی داستان ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ ہم آگے بڑھیں، ایک سوال کا جواب دینا

ضروری ہے۔ کیا اقبال جدید مغربی تہذیب کو تہذیب قرار دیتے تھے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جدید مغربی تہذیب تو تہذیب ہی نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ اس سوال کے جواب کے لیے خود اقبال سے رجوع کر لیا جائے۔

اس سلسلے میں کلیاتِ اقبال کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اقبال نے ۲۸ مقامات پر جدید مغربی تہذیب کو تہذیب قرار دیا ہے۔ غالباً ایک مقدمے میں ۲۸ گواہیاں کافی ہوتی ہیں لیکن ان گواہیوں کی مثالیں پیش کرنا بھی مفید طلب ہے۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا

ان کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا
لا کے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

کچھ غم نہیں جو حضرتِ واعظ ہیں تنگدست
تہذیبِ نو کے سامنے سر اپنا خم کریں

ان اشعار سے ثابت ہے کہ اقبال مغرب پر بے پناہ تنقید کے باوجود جدید مغربی تہذیب کے لیے تہذیب ہی کی اصطلاح پسند و استعمال کرتے ہیں۔ کل تہذیبوں کے چار بنیادی تصورات کے حوالے سے اقبال کی شاعری میں کارفرما الٰہیاتی اصول یعنی Ontological Principle پر گفتگو ہو گی، اس وقت تک کوئی اقبال کو بھی ''ٹیوشن'' پڑھانا چاہے تو بے شک پڑھا لے۔

(جاری ہے)

تہذیبوں کا تصادم اور فکرِ اقبال (۲)

سلیم احمد نے اپنی تنقیدی کتاب ''اقبال۔۔۔ایک شاعر'' میں اقبال کی نظم 'لا الہ الا اللہ' کو اقبال کی شاعری کی ''سورۂ اخلاص'' قرار دیا ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن مجید میں الٰہیات یا تصورِ توحید کے حوالے سے سورۂ اخلاص کی جو اہمیت ہے، وہی اہمیت اقبال کی شاعری میں مذکورہ نظم کو حاصل ہے۔یہی اقبال کی شاعری کا الٰہیاتی پہلو یا Ontological Dimer ہے۔یہ نظم آپ نے سیکڑوں بار پڑھی یا سنی ہوگی۔آج ایک بار پھر پڑھ لیجیے:

خودی کا سرِّ نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں لا الہ الا اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الہ الا اللہ
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ
یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الہ الا اللہ

گمان ہے کہ سات شعروں پر مشتمل اس نظم کے معنی سبھی کو معلوم ہوں گے لیکن جن لوگوں کے لیے نظم کی تفہیم میں کوئی مشکل ہے، ان کے لیے نظم کو آسان کر لیتے ہیں۔ اس کا سب سے بہتر طریقہ شاید یہ ہے کہ ہر شعر کو الگ الگ نثر میں ڈھال لیا جائے۔

۱۔ خودی یعنی Self کا پوشیدہ اسرار (Hidden Mystery) یہ ہے: نہیں ہے کوئی الہ سوائے اللہ کے۔ خودی اگر تلوار ہے تو لا الہ الا اللہ ڈھال ہے۔

۲۔ ہمارے زمانے کو اپنے ابراہیم کی تلاش ہے، اس لیے کہ جہاں بت خانہ ہوگا، وہاں لا الہ الا اللہ کی صدا ضرور بلند ہوگی۔

۳۔ تو نے فائدے اور نقصان کے دھوکے میں پڑ کر (ملّی) وقار کا سودا کر لیا اور سمجھ لیا کہ فائدہ باقی رہنے والا ہے۔ حالانکہ باقی رہنے والی حقیقت تو صرف لا الہ الا اللہ ہے۔

۴۔ دنیا کا سارا مال ومتاع اور اس سے تعلق کی صورتیں وہم وگمان کے بتوں کے سوا کچھ نہیں۔

۵۔ عقل نے زمان ومکان کے تصور کو پوجنا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ زمان ومکان کا وجود ہی نہیں۔

۶۔ لا الہ الا اللہ کی شہادت حالات کی محتاج نہیں۔ حالات اچھے ہوں یا برے، اس حقیقت کی گواہی لازم ہے۔

۷۔ خبردار رہ، کسی بھی اجتماعیت سے وابستگی میں خطرات ہیں۔ مت بھول کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں۔ یعنی کسی بھی اجتماعیت کو اپنے لیے الہ نہ بنا لینا۔

اشعار کی یہ نثر ضرورت کے مطابق ہے۔ یعنی جہاں مافی الضمیر کا بیان درکار تھا، وہاں مافی الضمیر بیان کر دیا گیا اور جہاں شعر کو نثر بنانا کافی تھا، وہاں شعر کو نثر بنا دیا گیا۔ بہرحال اب آیئے دیکھتے ہیں کہ اس نظم میں ماجرا کیا پیش آیا ہے۔

مفسرین اور علما، کرام نے فرمایا ہے کہ کلمۂ توحید اور کلمۂ رسالتؐ پورے دین کا خلاصہ ہے۔ قرآن وحدیث اس اجمال کی تفصیل ہیں۔ چنانچہ اقبال نے لا الہ الا اللہ کو ایک کسوٹی اور پیمانہ بنا کر پیش کیا ہے اور نظم میں جدید مغربی تہذیب کے پورے تہذیبی اور فکری کینوس کو سمیٹنے کی

کوشش کی ہے۔

اقبال کی شاعری میں خودی کا تصور بنیادی اور اسلامی فکر سے ماخوذ ہے۔ لیکن اقبال کو معلوم ہے کہ جدید مغربی تہذیب بھی خودی یا Self کا ایک تصور رکھتی ہے اور یہ تصور بھی مغربی تہذیب کے دائرے میں بنیادی ہے۔ مغرب میں اس حوالے سے سماجی اَنا یا Social Self اور اقتصادی انا یا Economic Self کی اصطلاحیں ملتی ہیں یا وہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسانی Self کی جڑیں سماجیات اور معاشیات میں پیوست ہو سکتی ہیں۔ لیکن اقبال اس Self کو مصنوعی یا کم از کم ثانوی Self سمجھتے ہیں اور اس نظم کے پہلے شعر میں دونوں تصورات کا ایک موازنہ یا Contrast وجود میں آتا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ حقیقی خودی کا راز اس کا سر یا اس کی Mystery لا الہ الا اللہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ثانوی اَنا اگر تلوار ہے تو لا الہ الا اللہ اس کے لیے ڈھال ہے اور جب تک انسان کو یہ ڈھال فراہم نہ ہو، انسان کا بچنا محال ہے۔ اس بحث کے ڈانڈے لفظ شخصیت یا Personality کے معنی کی بحث سے بھی جا ملتے ہیں۔

Persona مغربی تہذیب میں اس مصنوعی چہرے کو بت خانہ قرار دے دیا ہے اور ابراہیم کی تلمیح کے استعمال سے پیغمبرانہ روایت سے رجو کی اہمیت واضح کی ہے۔ اس لیے کہ کفر اور شرک کا علاج چھوٹے کفر اور شرک کے مقابلے پر بڑا کفر یا شرک لانے سے نہیں ہو سکتا، اس کا علاج صرف ایمان بالغیب ہے۔

تیسرے شعر میں اصل مسئلہ ''فریب سود و زیاں'' کا ہے۔ جدید مغربی فکر نے پوری دنیا میں افادیت پسندی کی وباء عام کر دی ہے اور افادیت پسندی کا فائدے اور نقصانات کے عمومی تصور سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک باضابطہ فلسفہ ہے جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ انسان کو وہی کام کرنا چاہیے جس میں فائدہ ہو۔ یعنی فی نفسہٖ نہ کوئی کام اچھا ہے نہ برا ہے۔ نہ مطلق نیکی کا وجود ہے نہ مطلق برائی کا۔ صرف فائدہ ہی قدر ہے۔ اقبال کے دور میں یہ فلسفہ تھا، اب ہمارا تجربہ ہے۔ چنانچہ اقبال یاد دلاتے ہیں کہ یہ دھوکا ہے اور اس کے چکر میں پڑ کر تو انفرادی یا اجتماعی وقار کا سودا نہ کر۔ کیونکہ فائدہ اور نقصان تو وہی ہے جس کو خدا نے فائدہ یا نقصان قرار دیا ہے، خواہ خدا کے

بتائے ہوئے فائدے میں بظاہر تجھے نقصان ہی کیوں نہ ہو رہا ہو۔

حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر امت کا ایک فتنہ ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے اور مال کا فتنہ دنیا کی محبت سے پیدا ہوتا ہے اور دنیا کی محبت آل اولاد کی محبت سے جنم لیتی ہے۔ اقبال نے چوتھے شعر میں ان تمام کو وہم و گمان کے بت قرار دیتے ہوئے ان پر خطِ تنسیخ پھیر دیا ہے اور ہمیں اصل حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اقبال کے زمانے میں یہ فتنہ اس لیے اہم ہو گیا تھا کہ مسلمان خلاصی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور اقتصادی مشکلات نے مسلمانوں کو گویا تاک لیا تھا۔

اقبال کے عہد کی ایک خاص بات زمان و مکان کا وہ مغربی فلسفہ تھا جو مادے اور وقت کو خدا کے مقام پر فائز کر چکا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ زندگی اور کائنات کی توجیہ کے لیے انسان کو اب خدا کے تصور کی ضرورت نہیں رہ گئی۔ اگرچہ یہ مغربی فلسفہ تھا لیکن نوآبادیاتی دور تھا، یورپی اقوام ساری دنیا پر مسلط تھیں اور ان کے توسط سے یہ فلسفہ ساری دنیا میں عام ہو رہا تھا اور اس نے ایک بڑے فکری بت کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔

اسلامی فکریات میں زمان و مکان کا انکار نہیں ہے لیکن اسلامی فکر انھیں علتِ ثانوی یا Secondery Cause سمجھتی ہے۔ خدا کا ارادہ اور اس کی مشیت کسی زمان کی پابند ہے نہ مکان کی۔ وہ کسی بات کا ارادہ کرتا ہے اور وہ ہو جاتی ہے۔ معجزے کا اصول یہی ہے۔ لیکن جدید مغربی فکر انسان کو معجزے کی روایت سے کاٹ کر اس کی عقل کو علت و معلول کا اسیر کر چکی تھی۔ اقبال کے نزدیک خدا ہوئی ہے زمان و مکاں کی ناری کا یہی مفہوم ہے۔

مسلمانوں کے سیاسی زوال اور یورپی اقوام کی غلامی نے مسلمانوں کو اس اندیشے میں مبتلا کر دیا تھا کہ نعوذ باللہ کہیں ان کا دین بھی تو ''زمانی'' نہیں تھا! اور یہ کہ کہیں کلمۂ حق کی شہادت کے تقاضے بھی تو آزادی سے مخصوص نہیں تھے۔ لیکن اقبال نے انھیں یاد دلایا کہ اس اندیشے کی کوئی اصل نہیں۔ مسلمان جس حال میں بھی ہوں، ان پر شہادتِ حق واجب ہے۔ بہار ہو کہ خزاں لاالہ الا اللہ۔

اقبال کے آخری شعر میں ''جماعت'' سے مراد گروہ بھی ہے، مسلک بھی، فرقہ بھی ہے تنظیم

بھی،قوم بھی ہے قبیلہ بھی، ریاست بھی ہے اور محض ادارہ یاOrganization بھی۔ یہاں تک کہ اس کا اطلاق رنگ اور نسل پر بھی ہوتا ہے۔اقبال کا عہد تو یوں بھی قوم پرستی اور نسل پرستی کا دور تھا اور یہ بلائیں مغرب سے آئی تھیں۔ یہ بلائیں موجود تو اس سے پہلے بھی رہی ہیں لیکن مغرب نے انھیں فکری اور فلسفیانہ بنیادیں فراہم کرنے کی کوشش کی تھی چنانچہ یہ اور بھی خطرناک ہوگئی تھیں۔ چنانچہ اقبال ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ اسلام ماورائے قومیت و رنگ و نسل حقیقت ہے چنانچہ مسلمانوں کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ کسی ایک دائرے میں محدود ہو کر اس کے مفادات کا ترجمان اور نگہبان بن جائے۔

آپ نے دیکھا کہ اقبال کی اس چھوٹی سی نظم میں کس بلا کا تہذیبی رن پڑا ہوا ہے اور دو تہذیبیں کیسی ہولناک عدم مطابقت کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے صف آراء ہیں۔ (جاری ہے)

تہذیبوں کا تصادم اور فکرِ اقبال (۳)

اقبال کی شاعری میں اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے الٰہیاتی اصول یا Ontological Principle کی نشاندہی اور ان کی کھلی عدم مطابقت کو ثابت کرنے کے بعد آیئے دیکھتے ہیں کہ ان کی شاعری میں اسلام اور مغرب کی نہادِ علم یا Epistimology کا کیا تصور ملتا ہے اور دونوں تہذیبوں کے تصورِ علم میں کیسی ہولناک جنگ برپا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہم یہ یاد دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس وقت ہم پینٹ شرٹ اور شلوار قمیص کی سطح پر تہذیبوں کا موازنہ نہیں کر رہے بلکہ ہمارا موازنہ تہذیبوں کی روح اور ان کے اصلِ اصول کی سطح پر ہے۔ یہ وہ سطح ہے جس کے بغیر ہم مذہبی کیا کافرانہ اور مشرکانہ تہذیب کا بھی تصور نہیں کر سکتے۔ اب آیئے اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے اصولِ علم کے سلسلے میں اقبال کے شعروں پر نظر ڈالتے ہیں۔

محسوس پر بنا ہے عالمِ جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
تعلیم پیرِ فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہے جس کو ہستیٔ غائب کی ہے تلاش

دانشِ حاضر حجابِ اکبر است
بت پرست و بت فروش و بت گر است

عہدِ حاضر کا علم (حقیقتِ اولیٰ اور انسان کے درمیان) سب سے بڑا حجاب یا پردہ ہے۔ یہ بت پرست، بت فروش اور بت بنانے والا ہے۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ
''تخمِ دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو
کانچہ کشتیم ز خجلت نتواں کرد درو''

(آخری شعر کا مفہوم)

ہم ایک اور بیج حاصل کر کے اسے نئے سرے سے بوئیں کیونکہ ہم نے جو کچھ بویا تھا، شرمندگی کے مارے اسے کاٹ نہیں سکتے۔

شیدائی غائب نہ رہ دیوانۂ موجود ہو
غالب ہے اب اقوام پر معبودِ حاضر کا اثر

تعلیم مغربی ہے بہت جرأت آفریں
پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج میں مار ڈینگ

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم؟
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

نہادِ علم سے متعلق اقبال کے یہ چند اشعار ہیں جن میں کہیں اقبال نے علم کی نہاد کی نشاندہی کی ہے اور کہیں علم کا تجزیہ کیا ہے تو کیا اب ان تمام اشعار کی تشریح کی جائے؟ غالباً زیرِ بحث موضوع کے سلسلے میں اقبال کا صرف ایک شعر ہی کافی ہے:

محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش

آسان لفظوں میں اقبال نے اس شعر میں یہ بتایا ہے کہ جدید مغربی تہذیب کا ''تصورِ علم'' حواس یا محسوسات پر کھڑا ہوا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مغربی مصرعے کا مفہوم یہی ہے۔ اقبال

کے یہ دو مصرعے دراصل دو مصرعے نہیں، دو تہذیبوں کی فوجیں ہیں اور اقبال صاف کہہ رہے ہیں کہ جو علم کے پہلے سرچشمہ اور اس سے پیدا ہونے والے علوم میں رچ بس جائے گا، اس کے مذہبی عقائد زیروزبر ہو جائیں گے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اسلامی عقائد اُس عالم سے تعلق رکھتے ہیں جہاں تک حس یا حواس کی رسائی ہی نہیں ہے۔ اس تک رسائی کے لیے انسان وحی کا محتاج ہے۔ چونکہ جدید مغربی تہذیب کا تصورِ علم وحی کو تسلیم نہیں کرتا، اس لیے وہ مذہبی عقائد کا انکار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مذہبی عقائد کی تحقیر کرتا ہے۔ اقبال کا یہ شعر پھر پڑھ لیجیے:

تعلیم پیرِ فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہے جس کو ہستیِ غائب کی ہے تلاش

مطلب یہ ہے کہ وہ شخص ''ناداں'' یا احمق ہے جس کو ہستیِ غائب یعنی خدا کی تلاش ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خدا کی تلاش ہی نادانی ہے تو آخرت اور جنت و دوزخ کا بھی کوئی وجود نہیں۔ اس سے خیر و شر، نیکی و بدی اور حسن و قبح تک کے پیمانے بدل کر رہ جاتے ہیں''۔

یہاں اس امر کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ حواس کی اطلاع یا ان کا علم بجائے خود کچھ نہیں۔ عقل اس کو مرتب کر کے اس سے نتائج نکالتی ہے لیکن عقل کا معاملہ یہ ہے کہ اسے جیسی اطلاع ملے گی، وہ ویسا ہی نتیجہ نکالے گی۔ یہ Data اور کمپیوٹر والا معاملہ ہے۔ کمپیوٹر کو جیسا Data فراہم کیا جاتا ہے، وہ ویسا ہی نتیجہ نکالتا ہے۔ علم رسائی ہے لیکن انہی وجوہ کی بنا پر اقبال جدید مغربی فکر کو رسائی کے بجائے ''حجابِ اکبر'' کہتے ہوئے اسے مسترد کر دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ اسلامی تہذیب اور جدید مغربی تہذیب کے درمیان کھلا تصادم نہیں تو اور کیا ہے؟ اقبال نے تو اس تعلیم کے نتائج دیکھ کر ملا عرشی کے فارسی شعر کے توسط سے یہ تک کہہ دیا ہے کہ اب ہمیں اپنے علم کا ایک نیا بیج بونا پڑے گا کیونکہ مغربی علم کے بیج نے تو ہمیں وہ چیزیں دی ہیں جن پر ہم شرمندہ ہی ہو سکتے ہیں۔ یہ مسلم دنیا میں ایک نئی Epistimology کے لیے بلند ہونے والی سب سے توانا آواز ہے اور یہ آواز کل پرسوں نہیں، بیسویں صدی کی پہلی دہائیوں میں بلند ہو چکی تھی مگر ہم نے اقبال کی آواز تک پر کان نہیں دھرے۔ اس سلسلے میں ہماری بے اعتنائی مجرمانہ بلکہ کافرانہ ہے اور اس

جرم اور کفر میں بڑے بڑے لوگ شامل ہیں۔ ہم مسلم عوام اور خواص کو یہ تک نہیں بتا سکے کہ اسلامی تہذیب اور جدید مغربی تہذیب کا تصورِ علم ایک دوسرے کی ضد ہے اور ہمیں اپنے تصورِ علم کے مطابق اپنے علوم کا احیاء کرنا ہوگا۔ اقبال کے بعد یہ حقیقت جس شخصیت نے سمجھی، وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ تھے جنہوں نے مغربی علوم کی نہاد یا Epistimology کی وجہ سے جدید تعلیمی اداروں کو نئی نسل کی قتل گاہیں قرار دیا تھا۔ اقبال اور مولانا کے ذکر سے ہمیں اکبر الٰہ آبادی یاد آ گئے جنہوں نے کہا تھا:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

خیر یہ گفتگو تو آگے جائے گی لیکن آئندہ منزل سے پہلے تہذیبوں کے تصادم پر تھوڑا سا سانس لیں۔ (جاری ہے)

تہذیبوں کا تصادم اور فکرِ اقبال (۴)

چند روز کے وقفے کے بعد ہم ایک بار پھر تہذیبوں کے تصادم اور فکرِ اقبال کی جانب لوٹ آئے ہیں۔ اس سے قبل دو قسطوں میں ہم دکھا چکے ہیں کہ اقبال کی شاعری میں الٰہیاتی سطح یعنی Ontological plane اور نہادِ علم یعنی Epistimological دائرے میں اسلامی تہذیب اور جدید مغربی تہذیب کے درمیان کیا فرق ہے۔ اس سے پہلے ایک قسط میں یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ جدید مغربی تہذیب پر بے پناہ اساسی تنقید کے باوجود اقبال نے درجنوں مقامات پر اس تہذیب کے لیے تہذیب ہی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

اقبال کی شاعری کا سرسری مطالعہ کرنے والوں پر بھی یہ حقیقت منکشف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ اقبال کے یہاں عقل اور دل یا خرد اور عشق کے درمیان ایک گہرا تضاد پایا جاتا ہے جو کئی صورتوں میں شدید تصادم کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ اقبال کا ذاتی مسئلہ ہے؟ یا اس کا اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب اور جدید فکر اور مغربی تہذیب سے کوئی تعلق ہے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے۔ یہ اقبال کا ذاتی مسئلہ نہیں۔ جدید مغربی تہذیب نے اپنی تاریخ کے ایک مرحلے پر عقل کا ایک خاص تصور وضع کیا اور پھر اسی کی اسیر ہوگئی۔ یہ تصور اسلامی فکر میں موجود عقل کے تصور کی تقریباً ضد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری عقل و خرد کی مذمت اور تنقید سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ ان کی شاعری میں ان تصورات کے لیے تحقیر اور تضحیک کا پہلو بھی ملتا ہے۔ اس کے برعکس عقل و خرد کے مقابلے میں اقبال عشق اور دل کو لاتے ہیں اور ان دونوں حقیقتوں کا بیان اقبال پر ایک سرشاری اور مستی طاری کر دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اقبال کے یہاں عقل و خرد کی مذمت اور تحقیر کیوں پائی جاتی ہے اور اس کی مختلف صورتیں کیا ہیں؟ پڑھیے اور (اپنا) سر دھنیے:

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے
بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے
خداوندا مجھے کیا ہو گیا ہے
خرد بیزار دل سے، دل خرد سے

پہلے شعر میں اقبال نے خرد پر الزام لگاتے ہوئے اس کے خلاف ایف آئی آر کٹوا دی ہے اور دوسرے شعر میں اپنے اندر برپا معرکے اور اس سے پیدا ہونے والی کیفیت کا ذکر کیا ہے۔ خیر آگے بڑھتے ہیں۔

عقل ''عیار'' ہے سو بھیس بدل لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ ملّا ہے نہ زاہد نہ حکیم

آہ یہ عقلِ زیاں اندیش کیا چالاک ہے
درد کے عرفاں سے ''عقلِ سنگ دل'' شرمندہ ہے

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
نشانِ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل کو ملتی نہیں اپنے بتوں سے نجات
عارف و عامی تمام بندۂ لات و منات
خوار ہوا کس قدر آدمِ یزداں صفات
قلب و نظر پر گراں ایسے جہاں کا ثبات

اقبال کے ان شعروں کو پڑھ کر خیال آتا ہے کہ اب عقل کے خلاف کہنے کو کیا رہ گیا ہوگا؟ لیکن اقبال کا آخری وار سب سے کاری ہے۔ فرماتے ہیں:

عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب

لیکن اس کے بعد اس مسئلے کے مغربی تہذیب سے متعلق دو حوالے۔۔۔ اقبال نے کہا ہے:

تڑپ رہا ہے فلاطوں میانِ غیب و حضور
ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اعراف

اور اس کے بعد پوری مغربی تہذیب کی روح کا صرف ایک مصرع میں بیان

فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری

دل کی خرابی تو خیر پھر بھی کچھ سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن ''خرد کی معموری'' کیا بلا ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ مغربی تہذیب دل کی خرابی میں مبتلا ہونے کے بعد سے صرف عقل کو پالنے پوسنے میں لگی ہوئی ہے۔ یعنی افلاطون تو بے چارہ غیب اور حضور کے درمیان تڑپ بھی رہا تھا مگر اقبال کے زمانے تک آتے آتے مغربی فکر غیب سے بے نیاز ہو کر صرف حضور پر مرتکز ہوگئی۔

محمد حسن عسکری نے اپنی معرکہ آراء تصنیف جدیدیت یعنی مغربی فکر کی گمراہیوں کا خاکہ میں لکھا ہے کہ افلاطون تک مغرب عقلِ کلی یعنی Intellect اور عقلِ جزوی یا Reason کے فرق سے واقف تھا لیکن اس کے شاگردِ رشید ارسطو کے بعد مغرب اس فرق کو بھولتا چلا گیا اور بالآخر اس نے عقلِ جزوی یا Reason ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ لیکن ان دونوں کا بنیادی فرق کیا ہے؟

عقل جزوی یعنی Reason دراصل تجزیہ کار عقل ہے اور وہ چیزوں کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے انھیں سمجھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تفہیم ادھوری یا ٹکڑوں کی تفہیم ہوتی ہے، شے کی کلیت یعنی

Totality کی تفہیم نہیں ہوتی۔ یہ عقل حواس کی فراہم کردہ معلومات سے آگے جانے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس ''عقلِ کلی'' یاIntellect وجدان اور الہام کے ذریعے شے کی پوری حقیقت کو سمجھ لیتی ہے اور اسے تجزیے کی زحمت نہیں کرنی پڑتی۔ اس کا اثر مغربی تہذیب پر یہ پڑا ہے کہ وہPerception کی اسیر ہوگئی اور ارسطو نے کہا کہ انسانی ذہن تصویروں کی مدد سے سوچتا ہے، اس کے بغیر مغرب میں مصوری اور مجسمہ سازی کی اتنی بڑی روایت پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ مگر اسلامی تہذیب ہزار مسائل کے باوجود عقلِ کلی کے تصور سے بے نیاز نہیں ہوئی اور مسلمانوں نے خواہ تفسیر لکھی ہو یا شاعری کی ہو وہ ساٹھ ستّر سال پہلے تک عقل کے ان تصورات، ان کے امتیازات اور جداگانہ وظائف یاFunctions سے آگاہ رہے ہیں۔ چنانچہ اقبال عقل کی مذمت کرتے ہیں تو وہ دراصل عقل کے اُس مغربی تصور کی مذمت کرتے ہیں جو ہمارے انفرادی اور اجتماعی شعور پر چھاپہ مار چکا تھا۔

آپ نے اقبال کے یہاں عقل کی مذمت اور اس کے معنی تو ملاحظہ کر لیے۔ اب ذرا ان کے یہاں عشق، جنوں اور دل کا بیان بھی دیکھ لیجیے۔

زمانہ عقل کو سمجھے ہوئے ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

دلِ بیدار فاروقی، دلِ بیدار کرّاری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم
عشق کی تقدیم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں رسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

غور کیا جائے تو اقبال کے یہاں عشق اور دل اسلامی تہذیب کے تناظر میں انسانی وجود کی کلّیت کے استعارے اور عقلِ کلّی کی علامتیں ہیں۔ چونکہ اقبال کے زمانے تک آتے آتے یہ علامتیں پسپا ہونے لگی تھیں، اس لیے اقبال نے ان کی بحالی اور انھیں ایک بار پھر زندہ کرنے کے لیے اپنے وجود کی پوری تخلیقی قوت صرف کر دی اور انھوں نے عقل اور دل اور عقل اور عشق کو ایک دوسرے کے مقابل لا کر دکھایا کہ ہم کیا ہیں اور مغرب کیا ہے؟ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اقبال نے ہر جگہ عقل پر دل اور عشق کی فوقیت ثابت کی ہے اور اپنی تہذیبی روایت پر ہمارا اعتماد بحال کیا ہے۔ دو تہذیبوں کے دو اساسی تصورات کی یہ عدم مطابقت اور یہ تصادم کلیاتِ اقبال میں ۷۰، ۸۰ سال سے موجود ہے اور کلیاتِ اقبال کو لگنے والی دیمک تک اس سے آگاہ ہے۔ بہرحال ان شاء اللہ آئندہ ہفتے مولانا مودودیؒ کی فکری کائنات سے تہذیبوں کا تصادم کشید کر کے دیکھا اور دکھایا جائے گا۔

تہذیبوں کا تصادم ۔۔۔مولانا مودودیؒ کیا کہتے ہیں؟(۱)

اسلام اور مغرب کے تعلق سے مولانا مودودیؒ کی فکر اپنی نہاد میں ''تہذیبی'' تھی اور یہ نہاد مولانا کی فکر میں ابتدا سے آخر تک موجود رہی۔ مثلاً مولانا نے تنقیحات کے مضمون بعنوان ''مرض اور اس کا علاج'' میں لکھا۔

''اس پورے نظام میں اگرچہ قلب (یعنی عقیدہ) بہت اہمیت رکھتا ہے مگر اس کی اہمیت اسی لیے تو ہے کہ وہ تمام اعضاء جوارح کو زندگی کی طاقت بخشتا ہے۔ جب اکثر و بیشتر اعضاء کٹ جائیں، جسم سے خارج کردیے جائیں یا خراب ہو جائیں تو اکیلا قلب تھوڑے بہت بچے کھچے خستہ و بیمار اعضاء کے ساتھ کیسے زندہ رہ سکتا ہے اور اگر زندہ بھی رہے تو اس زندگی کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟ (تنقیحات، صفحہ ۲۹۷)

مولانا نے یہ مضمون ۱۹۳۷ء میں لکھا تھا اور ان کی فکر کا یہ پہلو ۱۹۶۳ء میں بھی پوری طرح توانا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اسلامی اور مغربی تہذیب کے درمیان مصنوعی قربت تلاش کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا۔

''ہمارے بااثر طبقے، اہل مغرب کے سامنے یہ نقشہ پیش کررہے ہیں کہ ہم میں اور تم میں کسی لحاظ سے بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ جو تمہاری تہذیب، وہ ہماری تہذیب۔ جو تمہارا تمدن، وہ ہمارا تمدن''۔ (تہذیبی کشمکش میں علم و تحقیق کا کردار۔ صفحہ ۲۴ اور ۲۵)

مولانا نے اس تقریر میں ایسی تحقیق کا بھی ذکر کیا ہے جو اسلام اور مغربی تہذیب کو ایک دوسرے کے ساتھ آمیز کرنے کے لیے کی جارہی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''ایک اور قسم کی ریسرچ جو اب ہمارے ملک میں شروع ہورہی ہے، وہ یہ ہے کہ ریسرچ تو اسلام کی کی جائے مگر اس غرض کے لیے کہ ایک نیا اسلام تصنیف کیا جائے جو تمام مغربی افکار و اَقدار کے بالکل مطابق ہو اور اسلام کو کسی نہ کسی طرح ڈھال کر ایسا دکھایا جائے کہ گویا یہ بھی

مغربی تہذیب وتمدن کا ایک دوسرا ایڈیشن ہے۔ یہ ریسرچ بھی ہمارے کسی کام کی نہیں''۔ (ایضاً، صفحہ ۱۷)

ان حالات میں مولانا کیا چاہتے تھے؟ اس سوال کا جواب مولانا کے الفاظ میں یہ ہے کہ ہم اپنا فلسفہ، اپنی نفسیات، اپنی عمرانیات یہاں تک کہ اپنی یعنی اسلامی سائنس بھی پیدا کریں۔ کیونکہ مولانا کا پختہ یقین تھا کہ اس کے بغیر اسلامی تہذیب کونہیں اٹھایا جاسکتا۔ اس سلسلے میں مولانا نے مغرب کی ایسی تنقید پیدا کرنے کی ضرورت پر بھی بہت زور دیا جوان کے خیال میں مغرب کے پورے فکری نظام کو منہدم کردے۔ جیسا کہ ظاہر ہے یہ کام مغرب کو پڑھے بغیر ممکن نہیں تھا اور اس کام میں مغرب کے اہم لوگوں کی ببلوگرافی بھی بنانی پڑتی ہے۔ انگریزی کے مصنفین کے ساتھ بھی سر کھپانا پڑتا ہے۔

مولانا نے ادارۂ معارفِ اسلامی کراچی کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اس دارے کے سامنے تین کام رکھے۔ ان تحقیقی وتخلیقی منصوبوں کا اجمال مولانا کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

۱۔ ''سب سے پہلا کام ہم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ مغربی فکر اور مغربی فلسفۂ حیات کا جو طلسم بندھا ہوا ہے، اس کو توڑا جائے۔

۲۔ جو دوسرا کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تمام علوم وفنون کو نئے اسلوب اور اپنے طریقے پر مرتب کیا جائے تاکہ وہ ایک اسلامی تہذیب کی بنیاد بن سکیں۔

۳۔ تیسرا کام ہمارے سامنے یہ ہے کہ ایک نصاب مرتب کیا جائے جو اس طرز پر تعلیم کے قابل کتابیں تیار کرے''۔ (تہذیبی کشمکش میں علم وتحقیق کا کردار، صفحہ ۱۸، ۱۹، ۲۵)

مولانا کی اس تقریر کو اب ٹھیک ۴۳ سال ہوگئے۔ اس عرصے میں ہم مولانا کی آرزو کی کتنی تکمیل کرسکے۔ یہ کوئی راز نہیں ہے۔ ۴۳ برس آدھی صدی ہوتے ہیں اور آدھی صدی میں دنیا بدل جاتی ہے۔

بہرحال ثابت ہو چکا کہ مولانا تہذیبوں کے تصادم کے نہ صرف یہ کہ قائل تھے بلکہ وہ اس

تصادم کی بنیاد پر اسلامی تہذیب کے احیاء کی غیر معمولی خواہش رکھتے تھے اور اس سلسلے میں انھیں داڑھیوں کی موجودگی یا عدم موجودگی اور کسی کے روزے نماز کی گنتی کے بجائے دماغی قابلیت، ذہانت اور معلومات سے دلچسپی تھی اور ان کے لیے اس سلسلے میں صرف اسلام پر ایمان لے آنا کافی تھا۔ مولانا کو ''روحانی جاسوسی'' کا نہ خود شوق تھا، نہ وہ اسے پسند کرتے ہوں گے۔ خیر اکبر الہ آبادی اور اقبال سے ہوتے ہوئے ہم مولانا مودودیؒ تک آ پہنچے ہیں اور اب اردو میں محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کے حوالے سے اردو ادب میں اور عالمی سطح پر فرانس کے عظیم مفکر رینے گینوں، فرتھجوف شواں، آنند کمار سوامی، ٹائٹس برک ہارٹ اور ہیوسٹن اسمتھ وغیرہ کے ذریعے یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ عالمی ادب اور آرٹ میں اسلامی و مغربی تہذیب اور وسیع تر معنوں میں مشرقی تہذیب اور جدید مغربی تہذیب میں تصادم کی کون کون سی صورتیں پائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں سرسید اور حالی کا ذکرِ خیر بھی ہوگا اور ان پر ایسے مضامین لکھے جائیں گے جو بعض لوگ پیدا ہونے سے قبل ہی لکھ لیا کرتے تھے۔

تہذیبوں کا تصادم۔۔۔مولانا مودودیؒ کیا کہتے ہیں؟ (۲)

مولانا مودودیؒ جدید مغربی تہذیب کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے کسی کو یہ جاننا ہوتو اسے چاہیے کہ وہ یہ دیکھ لے کہ مولانا نے جدید مغربی تہذیب کے لیے کیسے کیسے نام رکھے ہیں؟

جس طرح انسانوں کے نام اوران کے معنی اہم ہوتے ہیں،اسی طرح تصورات، خیالات، قوموں اور تہذیبوں کے بارے میں وضع کی جانے والی اصطلاحیں اور تراکیب بھی اہم ہوتی ہیں۔ان سے معنی کے علاوہ اظہار کی شدت بھی ظاہر ہوتی ہے.جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نام رکھنے والے کے دل ودماغ میں اس کے حوالے سے کتنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی پائی جاتی ہے۔ اس حوالے سے جب ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا مودودیؒ نے مغربی تہذیب وتمدن کو کیا نام دیے ہیں تو دونام ہمارے سامنے آتے ہیں۔

۱) تخمِ خبیث

۲) شجرِ خبیث

(تنقیحات۔صفحہ ۴۵۔ایڈیشن ۱۹)

یاد رہے کہ تنقیحات پہلی بار کب شائع ہوئی،ہمیں نہیں معلوم۔لیکن مولانا نے جس مضمون میں مغربی تہذیب کو یہ دو''پیارے پیارے'' نام دیے ہیں، وہ ترجمان القرآن کے اکتوبر ۱۹۳۵ء کے شمارے میں شائع ہو چکا تھااور اس کا عنوان ہے''دورِ جدید کی بیمار قومیں''۔

مولانا نے مغربی تہذیب کوجس تیسرے نام سے پکارا ہے وہ ہے''جاہلیتِ خالصہ''۔

(تجدید واحیائے دین۔صفحہ ۱۴ اور ۱۶۔ایڈیشن ۱۹)

واضح رہے کہ تجدید واحیائے دین ۱۹۴۰ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔

مولانا نے مغربی تہذیب کے لیے جو چوتھا نام استعمال کیا ہے،وہ''باطل'' ہے۔

(تہذیبی کشمکش میں علم وتحقیق کا کردار۔صفحہ ۱۸)

مولانا نے مغربی تہذیب کو جو چار نام دیے ہیں، ان کے حوالے سے تین باتیں بالکل واضح ہیں۔ ایک یہ کہ مولانا مغربی تہذیب کو اس کی جڑ، شاخوں اور اس کے پھول و پھل سمیت مسترد کرتے ہیں۔ اور وہ ۱۹۳۰ء کی دہائی سے ۱۹۶۳ء تک کبھی بھی اس بات کے قائل نہیں رہے کہ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے درمیان کوئی پُل، پُلیا، Over Head Bridge اور Under Pass بنایا جائے۔ دوسری بات یہ واضح ہے کہ مولانا کی دینی حمیت اور تہذیبی حس اتنی تیز ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے لیے ''تخمِ خبیث'' اور ''شجرِ خبیث'' جیسی شدید اصطلاحیں استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے اور انھیں خیال نہیں آتا کہ انھیں نام نہاد علمی و تکنیکی اور پیشہ ورانہ اصطلاحوں میں گفتگو کرنی چاہیے جس پر مولانا اپنی دانشورانہ زندگی کے پہلے دن سے آخری دن تک کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ قادر تھے۔ تیسری بات یہ کہ مولانا کا ذہن اس حوالے سے بالکل صاف تھا کہ اصل چیز مجرد اسلام یا مجرد مغربی فکر و فلسفہ نہیں ہے۔ اصل چیز تہذیب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے ہزاروں مقامات پر اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا کا ذہن کس طرح سوچتا تھا، اس کا ذکر ہماری زبانی سننے کے بجائے خود مولانا کی زبانی سنیے۔ مولانا فرماتے ہیں: (حوالہ شروع)

''آپ اپنے گھر میں اپنے بچے کو چاہے یہ عقیدہ سکھا دیں کہ خدا ایک ہے اور رسول اللہ ﷺ اللہ کے نبی تھے اور چاہے آپ اس کے ذہن میں یہ بٹھا دیں کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے۔۔۔ لیکن جب تک کالجوں اور یونیورسٹیوں میں (اسلامی نقطہ نظر سے مرتب کیے ہوئے) نئے علوم نہیں پڑھائے جائیں گے، اُس وقت تک آپ یہ توقع نہ رکھیں کہ یہاں کبھی اسلامی تہذیب اٹھ سکتی ہے۔ بلکہ جو کچھ اس وقت موجود ہے، اس کا باقی رہنا بھی مشکل ہے''۔ (تہذیبی کشمکش میں علم و تحقیق کا کردار۔ صفحہ ۱۸)

مولانا ایک اور جگہ تہذیب کی مجرد تصورات پر فوقیت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (حوالہ شروع)

''ایسے حالات میں اسلامی تہذیب کا زندہ رہنا قطعی ناممکن ہے۔ کوئی تہذیب محض اپنے

اصولوں اور اپنے اساسی تصورات کے مجرد ذہنی وجود سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ عملی برتاؤ سے پیدا ہوتی ہے اور اسی سے نشو ونما پاتی ہے''۔ (تنقیحات۔صفحہ ۲۷۹۔۲۸۰)

اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب اور ان کے باہمی تعلق پر مولانا مودودیؒ کے خیالات آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب حالات نسبتاً ''معمول'' پر تھے تو مولانا مغربی تہذیب کے بارے میں کس شدت سے سوچ رہے تھے اور آج جب کہ اسلام اور اُمت مسلمہ کی بنیادوں پر ہر طرح کے حملے ہو رہے ہیں،تو کہا جا رہا ہے کہ کسی تہذیبی تصادم کا کوئی وجود ہی نہیں۔ڈنمارک کا ایک رکیک کارٹونسٹ رسولِ اکرمؐ کے کارٹون شائع کرتا ہے تو ہمارا شعور کہتا ہے کہ کارٹون کی جگہ خاکے کا لفظ استعمال کرلیا جائے اور ہم نہیں سوچتے کہ اس سے مغربی تہذیب کی خباثت اور ابلیسیت پر پردہ پڑتا ہے۔پوپ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی توہین کرتا ہے اور مسلم دنیا کے ۱۲ سفیر اگلے ہی ہفتے اُس سے بین المذاہب مکالمہ فرمانے ویٹی کن پہنچ جاتے ہیں اور ہم پوپ کو ''پوپ صاحب'' کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ آج ہمارے درمیان ہوتے تو اس پوری صورتحال پر ان کا ردِعمل کیا ہوتا؟ اس کا جواب واضح ہے۔جس شخصیت نے نسبتاً ''نرم حالات'' میں مغرب کے لیے جاہلیت خالصہ،باطل،تخم خبیث اور شجرِ خبیث کی اصطلاحیں وضع کیں،اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آج اس کا سایہ ہمارے سروں پر ہوتا تو وہ کیا کہتی اور کیا کرتی۔مگر سوال یہ ہے کہ مولانا نے اسلامی اور مغربی تہذیب کے درمیان صرف تصادم کا ذکر کیا ہے یا تصادم دکھایا بھی ہے؟ دکھایا تو کن بنیادوں پر؟ اس سلسلے میں ان شاء اللہ کل کی نشست میں بات ہوگی۔(جاری ہے)

تہذیبوں کا تصادم۔۔۔مولانا مودودیؒ کیا کہتے ہیں؟(۳)

مسلمانوں کی گزشتہ دو سو سالہ تاریخ کا اہم ترین سوال یہ ہے کہ مغرب سے ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اکبر الہ آبادی کی پوری زندگی اس سوال کا جواب دینے میں بسر ہوگئی۔ سرسید کے سامنے بھی اصل سوال یہی تھا اور اُن کا جواب اکبر کے جواب سے مختلف تھا۔ اقبال کی پوری فکری کائنات کا مرکزی نکتہ تلاش کیا جائے تو وہ بھی اسی سوال سے عبارت ہے کہ مغرب کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ مولانا مودودیؒ کی فکر کا بنیادی نکتہ بھی یہی ہے۔ چنانچہ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ مولانا نے اپنے کام کی ابتدا کرتے ہوئے روایتی علماء پر اس حوالے سے تنقید کی ہے کہ ان کا شعور مغربی فکر اور مغربی تہذیب کے اثرات کو نظرانداز کر کے کلام کر رہا ہے اور یہ کہ انھیں مغرب کے جدید تصورات اور مغربی تہذیب کی مبادیات کو سمجھنے میں دلچسپی نہیں۔ مثلاً مولانا نے ایک جگہ لکھا ہے (حوالہ شروع):

''درحقیقت یہ علماء کا کام تھا کہ جب اس (تہذیبی) انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی تو اُس وقت وہ بیدار ہوتے، آنے والی تہذیب کے اصول و مبادی کو سمجھتے، مغربی ممالک کا سفر کر کے ان علوم کا مطالعہ کرتے جن کی بنیاد پر یہ تہذیب اٹھی ہے''۔ (تنقیحات، صفحہ ۴۱)

چنانچہ مولانا نے دراصل وہ کام خود کیا جس کی توقع انھیں دوسروں سے تھی۔ لیکن آج ہمیں مولانا اور مغربی تہذیب کے تعلق سے جس سوال پر غور کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مولانا صرف تہذیبوں کے تصادم کی بات ہی کر کے رہ جاتے ہیں یا تصادم دکھاتے بھی ہیں؟

''جسارت'' کے جو قارئین تہذیبوں کے تصادم پر ہماری تحریریں پابندی اور تسلسل کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں، انھیں بخوبی علم ہے کہ ہم نے اسلامی اور مغربی تہذیب کے درمیان تصادم کے حوالے سے چار ایسے تصورات کی نشاندہی کی ہے جنھیں نظرانداز کر کے کوئی تہذیب، تہذیب نہیں کہلا سکتی، خواہ وہ مذہبی تہذیب ہو یا لادین تہذیب۔

یہ چار معیارات یا چار بنیادیں ذیل ہیں:

۱۔ الٰہیات (یعنی) Ontology

۲۔ نہادِ علم یا تصورِ علم (یعنی) Epistimology

۳۔ تصورِ تخلیق (یعنی) Efficient Cause

۴۔ زندگی کی حتمی قدر کا تعین (یعنی) Final Cause

نئے قارئین کی یاد دہانی کے لیے عرض ہے کہ الٰہیات کا آسان لفظوں میں مفہوم یہ ہے کہ کوئی تہذیب حقیقتِ اولیٰ کا کیا تصور رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی تہذیب ایک خدا کی قائل ہے اور اس کا خدا ایک ایسا خدا ہے جو وراء الوراء ہے۔ یعنی Super naturalism ہماری تہذیب کی الٰہیات ہے۔ اس کے برعکس مغربی تہذیب مادے کو خدا مانتی ہے اور اس کی الٰہیات Naturalism سے عبارت ہے۔

تصورِ علم کا مفہوم یہ ہے کہ کسی تہذیب میں یقینی علم کا سرچشمہ کیا ہے؟ اسلامی تہذیب کا جواب واضح ہے: وحی۔ اس کے برعکس جدید مغربی تہذیب سائنس کو یقینی علم کا سرچشمہ مانتی ہے۔

تصورِ تخلیق کے معنی یہ ہیں کہ کوئی تہذیب زندگی اور کائنات کی ابتداء کے بارے میں کیا کہتی ہے؟ اس سلسلے میں اسلامی تہذیب کا جواب واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کُن کہا اور یہ کائنات وجود میں آ گئی۔ مغربی تہذیب اس کے مقابلے پر ڈارون کے تصورِ ارتقاء کو لاتی ہے اور زمین پر پائی جانے والی زندگی اور بالخصوص انسان پر اس کا خاص طور پر اطلاق کرتی ہے۔

چوتھا اور آخری تصور یہ ہے کہ زندگی کی قدر و قیمت، اس کی کامیابی یا ناکامی کا حتمی معیار یا پیمانہ کیا ہے؟ اسلامی تہذیب اس سوال کے جواب میں ''نجات'' کا تصور پیش کرتی ہے۔ مغربی تہذیب اس کے مقابلے پر ''ترقی'' کا تصور لاتی ہے اور جیسا کہ ہم ایک ہزار بار عرض کر چکے ہیں کہ یہ چاروں تصورات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ چنانچہ اسلامی اور مغربی تہذیب بھی ایک دوسرے کی ضد ہے۔ یہ تہذیبوں کے موازنے کے تمام معیارات نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں تصورِ انسان اور تصورِ نفس کی بحث بھی آتی ہے مگر ہم اسے نظر انداز کر کے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ مولانا

مودودیؒ کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے۔ کیا ان کے یہاں بھی یہ چاروں تصورات موجود ہیں؟ اس کا جواب ایک ایسی ہاں ہے جو اندھوں کو دکھائی اور بہروں کو سنائی دے سکتی ہے۔ مگر اس کا ثبوت کیا ہے؟ آیئے دیکھتے ہیں۔ مثلاً مولانا نے فرمایا ہے:

''مذہبی نظریے کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ عالمِ طبیعی (Physical World) کے تمام آثار اور جملہ مظاہر کی علت کسی ایک طاقت کو قرار دیا جائے جو اس عالم سے بالاتر ہو۔ لیکن جدید تحریک کے علمبرداروں نے لازم سمجھا کہ خدا یا کسی فوق الطبیعت (Super Natural) ہستی کو فرض کیے بغیر کائنات کے معمے کو حل کریں۔ مغربی فلسفے اور مغربی سائنس نے جب اپنا سفر شروع کیا تو اگرچہ ان کا رخ خدا پرستی کی بالکل مخالف سمت میں تھا مگر چونکہ وہ مذہبی ماحول میں گھرے ہوئے تھے، اس لیے وہ ابتداً نیچریت یا Naturalism کو خدا پرستی کے ساتھ نباہتے رہے مگر جوں جوں وہ اپنے سفر میں آگے بڑھے نیچریت خدا پرستی پر غالب آ گئی''۔ (تنقیحات، صفحہ ۲۱ اور ۱۳، ایڈیشن ۱۹)

لیجیے بسم اللہ ہوگئی۔ مولانا کے یہاں سے دونوں تہذیبوں کا الہیاتی اصول (Ontological Principle) تو ہاتھ آ گیا۔ آیئے اب Epistimology یا تصورِ علم تلاش کریں۔ ٹھہریے! دیکھیے مولانا کیا فرماتے ہیں:

''......اسلام کا پورا نظامِ تہذیب وحی و رسالت کے اعتقاد پر قائم ہے اور وہاں (یعنی مغرب میں) وحی کی حقیقت ہی میں شک اور رسالت کے منجانب اللہ ہونے ہی میں شبہ ہے۔ وہ (یعنی اہلِ مغرب) مذہب اور مذہبیت کو ٹھوکر مار کر ایک دوسرے راستے پر چل پڑے جس میں مشاہدے اور تجربے اور قیاس و استقراء کے سوا کوئی اور چیز ان کی رہنما نہیں تھی''۔ (تنقیحات، صفحہ ۳۰ اور ۳۳، ایڈیشن ۱۹)

لیجیے وحی اور سائنس بھی ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ اب ذرا سنیے تو مولانا کیا کہہ رہے ہیں:

''ڈارون کے نظریۂ ارتقا نے اس نیچریت یا مادیت کو استحکام بخشنے اور ایک مدلل اور منظم علمی نظریے کی حیثیت دینے میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔ (اس نظریے نے یہ خیال عام کیا کہ)

زندگی کے ادنیٰ مراتب سے لے کر اعلیٰ مراتب تک موجودات کا ارتقاء ایک ایسی فطرت کے تدریجی عمل کا نتیجہ ہے جو عقل وحکمت کے جوہر سے عاری ہے۔ انسان اور دوسری انواع حیوانی کو پیدا کرنے والا کوئی صانع حکیم نہیں ہے بلکہ وہی ایک جاندار مشین جو کبھی کیڑے کی شکل میں رینگا کرتی تھی، تنازعہ للبقاء، بقائے اصلح اور انتخابِ طبعی کے نتیجے کے طور پر ذی شعور اور ناطق انسان میں نمودار ہوگئی''۔ (تنقیحات، صفحہ ۱۷، ایڈیشن ۱۹)

مولانا کے یہاں کسی کو اسلام کا نظریۂ تخلیق پڑھنا ہو تو ان کی کتاب ''دینیات'' سے رجوع کرنا چاہیے۔ مگر تہذیبوں کی چوتھی بنیاد، چوتھا معیار، Final Cause؟ وہ مولانا کے یہاں کہاں ہے؟ لیجیے پڑھیے، مولانا لکھتے ہیں:

''اخلاقیات میں اسلام کے پیشِ نظر آخرت کی کامیابی ہے اور مغرب کے پیشِ نظر دنیا کا فائدہ (یعنی ترقی)''۔ (تنقیحات، صفحہ ۲۱، ایڈیشن ۱۹)

ڈھٹائی کی اور بات ہے ورنہ اکبر الٰہ آبادی اور اقبال کے بعد مولانا مودودیؒ کے یہاں سے بھی تہذیبوں کا تصادم حتمی طور پر ثابت کیا جاچکا ہے اور مولانا اس تصادم میں ان چار مبادیات تک محدود نہیں، انھوں نے سیاست، ریاست، معیشت، قومیت، یہاں تک کہ ضبطِ ولادت میں بھی تہذیبوں کی عدم مطابقت ثابت کی ہے۔ تو پھر وہ کون لوگ ہیں جو ہماری تاریخ کے تین بڑے لوگوں کی اجتماعی بصیرت کو پھلانگ کر کھڑے ہونے کی بدتہذیبی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ دیکھنا چاہیے کہ یہ کہیں امریکا اور مغرب کے ایجنٹ تو نہیں؟ کہیں یہ ہم سے ہمارا اجتماعی حافظہ چھین کر ہمیں مغرب کے لیے نرم چارہ تو نہیں بنا دینا چاہتے؟ مگر مولانا اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے تصادم میں ہم سے کیا کام لینا چاہتے تھے؟ ادارۂ معارفِ اسلامی کراچی کی افتتاحی تقریب میں مولانا نے ہمارے سامنے کیا اہداف رکھے تھے اور ان اہداف کے حوالے سے ۴۳ برسوں میں کیا پیش رفت ہوئی، اس پر کل بات ہوگی۔

تہذیبوں کا تصادم۔۔۔مولانا مودودیؒ کیا کہتے ہیں؟ (۴)

اردو کے دو عظیم شاعروں اکبرالہ آبادی اور علامہ اقبال کے یہاں تہذیبوں کا تصادم ہم تفصیل کے ساتھ دکھا چکے ہیں۔تاریخی تسلسل کے اعتبار سے مولانا مودودیؒ کا نمبر اکبراور اقبال کے بعد آتا ہے اور گزشتہ ہفتے ہم نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ ان شاءاللہ آئندہ جمعہ سے ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ تہذیبوں کے تصادم کے بارے میں مولانا مودودیؒ کی فکری کائنات سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے اور اس سلسلے میں مولانا کا موقف کیا ہے۔مولانا تہذیبوں کے تصادم کے حق میں ہیں یا اس کے خلاف؟

کرنے کو تو ہم نے آپ سے وعدہ کرلیا مگر مولانا کی تحریریں تو بحرِ ذخّار ہیں۔۱۰۰ سے زائد کتب۔ٹھیک طرح سے ان کے نام پڑھنے کے لیے بھی آدھا گھنٹہ چاہیے (آخر مولانا اتنا کیوں لکھتے تھے؟) کجا یہ کہ ان میں تہذیبوں کا تصادم تلاش کرنا ہو۔اکبراور اقبال کو پڑھنا اس اعتبار سے آسان ہے کہ دونوں کی کلیات موجود ہیں۔ایک کتاب لی اور پڑھنے بیٹھ گئے۔لیکن مولانا کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔چنانچہ گھبرا کر ہم نے فیصلہ کیا کہ خواہ ہم مولانا کے یہاں تہذیبوں کا تصادم ثابت نہ کرسکیں لیکن مولانا کی صرف دو کتابوں اور ان کی تقریر پر مشتمل ایک کتابچے سے آگے ہرگز نہیں بڑھیں گے۔تو آئیے کام شروع کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا مولانا تہذیبی تصادم کے قائل تھے؟ اور کیا ان کی تحریروں میں تہذیبوں کے تصادم کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے؟

اتفاق دیکھیے یہ ستمبر کا مہینہ ہے۔مولانا مودودیؒ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۳ء کے روز کراچی میں تھے اور اہل علم سے خطاب فرما رہے تھے۔مولانا کی تقریر کا عنوان تھا ''تہذیبی کشمکش میں علم و تحقیق کا کردار''۔

یہ تقریر ادارۂ معارفِ اسلامی کراچی کی افتتاحی تقریب کے موقع پر کی گئی۔

لیجیے بسم اللہ تو ہوگئی۔''تہذیبی کشمکش'' کے معنی تہذیبی تصادم ہی کے تو ہیں۔لیکن اس

اصطلاح کو دیکھا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا، خیال آیا کہ کہیں کتابچے پر ''تہذیبی کشمکش'' کے بجائے ''تہذیبی کشمش'' تو نہیں لکھا ہوا۔ بھلا مولانا ۱۹۶۳ء میں تہذیبی کشمکش کے قائل کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اُس وقت تو سیموئل ہن ٹنگٹن بچہ تھا اور اس کے Clash of Civilization کے نظریے کو سامنے آنے میں چالیس سال تھے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اقبال اگر ۱۹۲۰ء میں اور اکبر الٰہ آبادی ۱۸۹۰ء میں تہذیبوں کے درمیان تصادم دیکھ سکتے تھے تو مولانا مودودیؒ ۱۹۶۳ء میں ''تہذیبی کشمکش'' کیوں نہیں دیکھ سکتے تھے؟ لیکن تہذیبی کشمکش کی اصطلاح میں ایک ابہام ہے۔ اس میں تصادم والی بات نہیں۔ چنانچہ تہذیبی کشمکش میں علم و تحقیق کا کردار پڑھ کر لطف نہیں آیا۔ چنانچہ کتابچہ رکھا اور بے خیالی میں ''تنقیحات'' اٹھالی۔ فہرستِ مضامین پر نظر پڑی۔ دوسرے مضمون کا عنوان تھا ''ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا انحطاط''۔ دل یہ سوچ کر خوش ہوا کہ مولانا بھی اسلامی تہذیب کی اصطلاح کو پسند کرتے تھے۔ کتاب کے پانچویں مضمون کے عنوان پر نظری پڑی:

''مغربی تہذیب کی خودکشی''

ارے ارے۔۔۔ یہ مولانا کو کیا ہوگیا، کیا ان کو معلوم نہیں کہ مغربی تہذیب تو تہذیب ہی نہیں تو پھر انھوں نے مغربی تہذیب کی اصطلاح کیسے استعمال کرلی۔ خیر تنقیحات کا مطالعہ شروع کیا۔ پہلے مضمون کا عنوان تھا ''ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب''۔ اچانک مضمون کے ایک اقتباس پر نظری پڑی۔ جو ہم نے پڑھا، آپ بھی پڑھ لیجیے۔ پہلے پڑھ چکے ہیں تو ایک بار پھر پڑھ لیجیے۔ مولانا فرماتے ہیں: (حوالہ شروع)

''مغربی تہذیب کے ساتھ جن قوموں کا تصادم ہوا ان میں سے بعض تو وہ تھیں جن کی کوئی مستقل تہذیب نہ تھی۔ بعض وہ تھیں جن کے پاس اپنی ایک تہذیب تو تھی مگر ایسی مضبوط نہ تھی کہ کسی دوسری تہذیب کے مقابلہ میں وہ اپنے خصائص کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی۔ بعض وہ تھیں جن کی تہذیب اپنے اصول میں اس آنے والی تہذیب سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہ تھی۔ ایسی تمام قومیں تو بہت آسانی سے مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ گئیں' اور کسی شدید تصادم کی نوبت

نہ آنے پائی، لیکن مسلمانوں کا معاملہ ان سب سے مختلف ہے۔ یہ ایک مستقل اور مکمل تہذیب کے مالک ہیں۔ ان کی تہذیب اپنا ایک مکمل ضابطہ رکھتی ہے جو فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ مغربی تہذیب کے اساسی اصول کلیتہً اس تہذیب کے مخالف واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدم قدم پر یہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں اور ان کے تصادم سے مسلمانوں کی اعتقادی اور عملی زندگی کے ہر شعبے پر نہایت تباہ کن اثر پڑ رہا ہے''۔

(حوالہ ختم) (تنقیحات۔صفحہ ۱۰۔۱۹واں ایڈیشن)

حوالہ تو آپ نے ملاحظہ کرلیا۔ اب یہ بھی پڑھ لیجیے کہ تنقیحات میں شامل مولانا کا یہ مضمون ترجمان القرآن کی اشاعت برائے ستمبر ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا تھا۔ یعنی یہ سموئل ہن ٹنگٹن کی پیدائش سے بھی بہت پہلے کی بات ہے۔ یہ تو اچھا ہی ہوا کہ ہم محقق نہیں ہیں ورنہ ہم ثابت کر دیتے کہ مولانا کو تہذیبی تصادم کا خیال عموماً ستمبر کے مہینے میں آتا تھا۔ اب دیکھیے ناں، انھوں نے ستمبر ۱۹۶۳ء میں ادارۂ معارفِ اسلامی کراچی کی بنیاد رکھتے ہوئے تہذیبی کشمکش پر طویل تقریر کی اور اس سے ٹھیک ۲۹ سال قبل اسلامی اور مغربی تہذیب میں باضابطہ تصادم کرڈالا اور اہم بات یہ ہے کہ تہذیبوں کی اصطلاح ہی استعمال کی، حالانکہ مولانا چاہتے تو خیر اور شر، حق و باطل، ایمان اور کفر کی اصطلاحیں بھی استعمال کر سکتے تھے۔ یہاں ایک خیال آتا ہے، مولانا عہد ساز انسان تھے مگر تھے تو آدمی ہی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان سے اضطراری حالت میں تہذیبوں کے تصادم کی اصطلاح استعمال ہوگئی ہو۔ یعنی یہ مولانا کا مستقل خیال یا رائے نہ ہو۔ اس خیال نے ہمیں دہلا دیا۔ آدمی متقین، صالحین، مومنین، عابدین اور زاہدین میں سے نہ ہو اور علم بھی اس کی گرہ میں نہ ہو تو قدم قدم پر ڈرتا رہتا ہے۔ چنانچہ ڈرتے ڈرتے تنقیحات کے صفحات میں آگے بڑھے۔ تنقیحات کے صفحہ ۱۸ پر ایک اقتباس دیکھا۔ آپ بھی دیکھیے: (حوالہ شروع)

''اس کا نظریہ اسلام کے نظریہ کی بالکل ضد ہے۔ اس کا راستہ اس راستہ کی عین مخالف سمت میں ہے جو اسلام نے اختیار کیا ہے۔ اسلام جن چیزوں پر انسانی اخلاق اور تمدن کی بنا رکھتا ہے ان کو یہ تہذیب بیخ و بُن سے اُکھاڑ دینا چاہتی ہے اور یہ تہذیب جن بنیادوں پر انفرادی سیرت

اور اجتماعی نظام کی عمارت قائم کرتی ہے ان پر اسلام کی عمارت ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتی۔ گویا اسلام اور مغربی تہذیب دو ایسی کشتیاں ہیں جو بالکل مخالف سمتوں میں سفر کر رہی ہیں۔ جو شخص ان میں سے کسی ایک کشتی پر سوار ہوگا اسے لامحالہ دوسری کشتی کو چھوڑنا پڑے گا اور جو بیک وقت ان دونوں پر سوار ہوگا اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے''۔ (حوالہ ختم)

چلتے چلتے تنقیحات کے مضمون ''دورِ جدید کی بیمار قوتیں'' کا بھی ایک اقتباس پڑھ لیجیے۔ مولانا لکھتے ہیں: (حوالہ شروع)

''اسلام کے ساتھ مغربی تہذیب کا تصادم جن حالات میں پیش آیا وہ ان حالات سے بالکل مختلف ہیں جن میں اس سے پہلے اسلام اور دوسری تہذیبوں کا تصادم ہوا تھا''۔ (حوالہ ختم)

(تنقیحات۔ صفحہ ۳۸)

جی حضور! تو اب فرمائیے کہ تہذیبوں کا تصادم کس کی ایجاد ہے؟ سیموئل ہن ٹنگٹن کی یا اکبر الہ آبادی، اقبال اور مولانا مودودی کی؟ علمی اصول تو یہ ہے کہ جس شخص کا دعویٰ زیادہ پرانا ہو، اسے ''قائد'' کہا جائے اور جو وہی دعویٰ بعد میں دوہرائے اسے ''مقلد'' گردانا جائے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بے چارہ ہن ٹنگٹن تو تہذیبوں کے تصادم میں بالکل پھسڈی رہ گیا۔ اس سے بہت پہلے مولانا مودودی، اقبال اور اکبر الہ آبادی اس تصور کو استعمال کر کے پھینک چکے تھے۔ یہاں یہ سوال بھی اہم ہے کہ امریکا اور مغرب کے ایجنٹ کون ہیں؟ وہ جو اپنی فکری تاریخ سے مثالیں لا لا کر ثابت کر رہے ہیں کہ یہ بات نئی نہیں، یا وہ جو تہذیبوں کے تصادم کا انکار کر رہے ہیں، اس پر پردہ ڈالنے کے لیے کوشاں ہیں؟ یہاں تک کہ حقائق کا اظہار کرنے والوں پر طنز و تحقیر کے تیر چھوڑے جا رہے ہیں۔ خیر جس کا جو کام ہے وہ وہی کرتا ہے، حالات جیسے بھی ہوں، غریب الدیار مسافر اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ مگر یہ تو مولانا مودودیؒ کے حوالے سے محض ابتدا ہے، سوال یہ ہے کہ مولانا تہذیبوں کے تصادم کے قائل تھے تو وہ مغربی تہذیب کو کیا سمجھتے تھے؟ دل تھام کر سنیے۔ (جاری ہے)

تہذیبوں کا تصادم۔۔۔مولانا مودودیؒ کی تحریروں کی روشنی میں

مولانا کی فکری عظمت یہ ہے کہ انھوں نے تقریباً ۵۰ سال پہلے مغرب کے تصور ضبط ولادت پر تنقید کی اور علمی بنیاد پر اس کا فکری محاکمہ کر کے بتایا کہ یہ تصور مسلمانوں کے لیے تو خیر تباہ کن ہے ہی، مغربی تہذیب کے لیے بھی یہ زہرِ قاتل ثابت ہوگا اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ضبطِ ولادت نے مغربی تمدن کو بوڑھا کر دیا ہے۔ کم و بیش پورا یورپ بوڑھوں کا یورپ بن کر ابھر رہا ہے اور وہاں آبادی کی شرح نمو دو فیصد سے بھی کم ہوگئی ہے۔ یہ وہ شرح ہے جس پر کسی معاشرے کو تا دیر زندہ و توانا نہیں رکھا جا سکتا۔ اقبال نے کہا تھا:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

مولانا نے الجہاد فی الاسلام میں دکھایا ہے کہ ''اسلام کی عسکریت'' دوسری تہذیبوں کی عسکریت سے کن بنیادوں پر اور کس حد تک مختلف ہے۔ لیکن اگر ہم یہاں الجہاد فی الاسلام اور ضبطِ ولادت کو ''کوٹ'' کرنے لگے تو تہذیبوں کا تصادم صرف ان دو کتب کی بنیاد پر ایک سال جاری رہے گا۔ چنانچہ یہاں ہم آپ کی سہولت کے لیے ایک ایسا اقتباس پیش کرتے ہیں جو ایک حد تک Two in one کا شاہکار ہے۔ مولانا نے لکھا ہے:

''قدرتِ الٰہی نے دو زبردست شیطان مغربی قوموں پر مسلط کر دیے ہیں جو ان کو ہلاکت اور تباہی کی طرف کھینچے لیے جا رہے ہیں۔ ایک قطع نسل کا شیطان ہے اور دوسرا قوم پرستی کا شیطان۔ پہلا شیطان ان کے افراد پر مسلط ہے اور دوسرا ان کی قوموں اور سلطنتوں پر۔ پہلے نے ان کے مردوں اور ان کی عورتوں کی عقلیں خراب کر دی ہیں۔ وہ خود ان کے اپنے ہاتھوں سے ان کی نسلوں کا استیصال کرا رہا ہے۔ وہ انھیں منع حمل کی تدبیریں سمجھاتا ہے۔ اسقاطِ حمل پر آمادہ کرتا ہے۔ عملِ تعقیم (Stealisation) کے فوائد بتاتا ہے جس سے وہ اپنی قوتِ تولید کا بیج ہی مار

دیتے ہیں۔ انھیں اتنا شقی القلب بنا دیتے ہیں کہ وہ بچوں کو آپ ہلاک کر دیتے ہیں۔ غرض یہ شیطان وہ ہے جو بتدریج ان سے خودکشی کرا رہا ہے۔

دوسرے شیطان نے ان کے بڑے بڑے سیاسی مدبروں اور جنگی سپہ سالاروں سے صحیح فکر اور صحیح تدبر کی قوت سلب کر لی ہے۔ وہ ان میں خود غرضی، مسابقت، منافرت، عصبیت اور حرص و طمع کے جذبات پیدا کر رہا ہے۔ وہ ان کو مخاصم اور معاند گروہوں میں تقسیم کر رہا ہے۔ انھیں ایک دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھاتا ہے کہ یہ بھی عذابِ الٰہی کی ایک صورت ہے۔ اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا وَّ یُذِیۡقَ بَعۡضَکُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ ۔ وہ ان کو ایک بڑی زبردست خودکشی کے لیے تیار کر رہا ہے جو تدریجی نہیں بلکہ ناگہانی ہوگی۔ اس نے تمام دنیا میں بارود کے خزانے جمع کر دیے ہیں اور جگہ جگہ خطرے کے مرکز بنا رکھے ہیں۔ اب وہ صرف ایک وقت کا منتظر ہے، جونہی اس کا وقت آیا وہ کسی ایک خزانۂ بارود کو شعلہ دکھا دے گا اور پھر آن کی آن میں وہ تباہی نازل ہوگی جس کے آگے تمام پچھلی قوموں کی تباہیاں ہیچ ہو جائیں گی''۔ (تنقیحات، صفحہ ۶۸)

ہم اپنے ایک گزشتہ کالم میں مولانا کے یہاں سے تصورِ توحید کی تشریح آپ کی خدمت میں پیش کر چکے۔ اس تشریح میں مولانا نے بتایا تھا کہ آپ ذرا ''نہیں ہے کوئی اِلٰہ سوائے اللہ کے'' کہہ کر تو دیکھیں ساری دنیا آپ کی دشمن ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ آپ کے اپنے ماحول سے بھیڑیے اور موذی جانور نکل نکل کر آپ پر حملہ کریں گے۔ بلاشبہ اس کا تجربہ ہر اس شخص کو ہوتا ہے جو کسی بھی درجے میں حق کا اعلان کرے۔ بہرحال آج ہم قرآن پاک کے حوالے سے مولانا کا ایک اقتباس آپ کی نذر کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

یہ دنیا کے عام تصورِ مذہب کے مطابق ایک نری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رموز حل کر لیے جائیں جیسا کہ اس مقدمہ کے آغاز میں بتایا جا چکا ہے۔ یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے، اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ گھر گھر سے ایک ایک سعید روح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعیِ حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشے

گوشے سے ایک ایک فتنہ جو اور فساد پرور کو بھڑ کا کر اٹھایا اور حامیانِ حق سے ان کی جنگ کرائی۔ ایک فردِ واحد کی اس طویل و جاں گسل کشمکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اس نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاعِ کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم نہ رکھیں اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کا اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قران کے الفاظ پڑھ پڑھ کر کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اُسی طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزولِ قرآن کے وقت پیش آئے تھے۔ مکے اور حبش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و اُحد سے لے کر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا، منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے اور سابقینِ اولین سے لے کر مولفۃ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ لیں گے اور برت بھی لیں گے۔ یہ ایک اور ہی قسم کا ''سلوک'' ہے، جس کو میں ''قرآنی سلوک'' کہتا ہوں۔ اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے، قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آ کر بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اس منزل میں اترتی تھیں اور یہ ہدایت لے کر آتی تھیں۔ اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لغت اور نحو اور معانی اور بیان کے کچھ نکات سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی روح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے۔

پھر اس کلیہ کے مطابق قرآن کے احکام، اس کی اخلاقی تعلیمات، اس کی معاشی اور تمدنی ہدایات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اصول و قوانین آدمی کی سمجھ میں اس وقت تک آ ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ عملاً ان کو برت کر نہ دیکھے۔ نہ وہ فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی زندگی کو اس کی پیروی سے آزاد کر رکھا ہو اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہو سکتی ہے جس کے سارے ہی اجتماعی ادارے اس کی بتائی ہوئی روش کے خلاف چل رہے ہوں''۔ (تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ صفحہ ۳۳۔۳۴)

تہذیبوں کا تصادم۔۔۔مودودیؒ کی تحریروں کی روشنی میں

تہذیبوں کے تصادم کے سلسلے میں ہمیں حسبِ وعدہ ممتاز عالمِ دین اور دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم مولانا قاری طیبؒ کی تحریروں کی جانب جانا تھا، لیکن ہمارے متعدد قارئین نے اس پر شکوہ کردیا۔ ان کی گفتگو کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ بے شک اکبر الہ آبادی، اقبال، مولانا مودودیؒ اور سید قطب شہید کی تحریروں سے تہذیبوں کا تصادم الف سے ے تک ثابت ہو چکا ہے اور بے شک اس کے بعد مولانا طیب کے پاس جانا چاہیں تو ضرور جائیں لیکن اس سے قبل مولانا مودودیؒ کی تحریروں کے ساتھ انصاف کریں۔ آپ ''تنقیحات'' اور مولانا کی ایک تقریر کے حوالے سے چار قسطیں لکھ کر آگے بڑھ گئے، یہ ٹھیک نہیں۔ ہم نے چونکہ چنانچہ کی کوشش کی مگر بے سود۔ غور کیا تو محسوس ہوا کہ یہ نکتہ کئی اعتبار سے اہم ہے۔

اس کی ایک اہمیت تو یہی ہے کہ مولانا مودودیؒ پر جسارت کے قارئین کا سب سے زیادہ حق ہے۔ پھر مولانا کی تحریروں کا معاملہ یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے مولانا کو پورا پڑھا ہی نہیں۔ جن لوگوں نے پڑھا ہے، وہ بھول گئے ہیں۔ کچھ لوگ بھولے نہیں ہیں مگر شاید بھولنا چاہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا کی ''انقلابی تعبیر'' جو تقاضے کرتی ہے، اس سے ہم جیسوں کی فکر و عمل کے سارے عیب عیاں ہو جاتے ہیں اور ہماری حالت دیکھ کر بچے تک کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا اپنا معاملہ ہے تو ہماری مشکل دو چند ہے۔ ہم ''صبح ہو یا شام مجھے سونے سے کام'' کے راسخ العقیدہ ماننے والے ہیں۔ لیکن جی کڑا کر کے سوچا کہ آؤ ایک بار پھر مولانا کی تمام تحریریں پڑھ ڈالیں جن میں مولانا نے اسلام اور تہذیب کی انفرادیت اور دوسری تہذیبوں بالخصوص مغربی تہذیب کے ساتھ اس کا تصادم دکھایا ہے۔ اس کام سے تکلیف تو بہت ہوئی مگر مولانا کی پوری فکر کا خاکہ بھی ذہن میں تازہ ہو گیا۔ اب آپ تک اس خاکے کی ترسیل کا کام آج سے شروع ہو رہا ہے، لیکن اس سلسلے میں دو تین باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

۱۔ مولانا مودودیؒ کی بیشتر تحریروں کا مطلب ان کی تمام تحریریں نہیں، موضوع سے متعلق اہم ترین تحریریں ہیں۔

۲۔ تحریروں کا یہ سلسلہ صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے یا تو مولانا کو پورا نہیں پڑھا یا پڑھا ہے تو بھول گئے ہیں۔ اس اعتبار سے اس سلسلے کو مولانا کے اجتماعی موضوعاتی مطالعے کی ایک نشست سمجھیے اور یاددہانی کے ذیل میں شامل کر لیجیے۔

۳۔ چونکہ یہ سلسلہ طویل ہو سکتا ہے اور اس سے دوسرے موضوعات پر لکھنے کی آزادی متاثر ہو سکتی ہے، اس لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ ہر ہفتے اس کی دو قسطیں پیش کی جائیں گی جو جمعہ اور ہفتہ یا پھر اتوار اور پیر کو شائع ہوا کریں گی۔ کوشش کی جائے گی کہ مولانا کی تحریر کا کوئی اقتباس Repeat نہ ہونے پائے اور ہر اقتباس میں نیا موضوع یا نئی بات سامنے آئے۔ تو آیئے کام شروع کرتے ہیں۔ ذرا دیکھیے تو مولانا توحید کے تصور کی کیا تعبیر پیش فرما رہے ہیں:

''توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خودمختاری یا غیراللہ کی حاکمیت والوہیت کی بنیاد پر بنا ہو' جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر ایک نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا آپ کے موذنوں کو اشھد ان لا الہ الا اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لیے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں' نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے' اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرمانروا نہیں ہے۔ کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا' کسی قانون کو نہیں مانتا' کسی عدالت کے حدودِ اختیارات (Jurisdiction) مجھ تک نہیں پہنچتے' کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے' کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں' کسی کے امتیازی حقوق' کسی کی ریاست' کسی کا تقدس' کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا' ایک اللہ کے سوا مَیں سب سے باغی اور سب سے منحرف ہوں تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے

پیٹوں برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں، دنیا خود آپ سے لڑنے آجائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکا یک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں''۔
(اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے، صفحہ ۲۷)

مولانا کی تحریر کے اس اقتباس سے درج ذیل نکات عیاں ہوتے ہیں:

۱۔ لا الہ الا اللہ جو اسلامی تہذیب کا الٰہیاتی یا Ontological اصول ہے، اپنی نہاد میں اتنا انقلابی ہے کہ محض اس کا اظہار ہی کشمکش اور تصادم شروع کر دیتا ہے اور اگر کہیں ایسا نہیں ہو رہا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ اس کے اعلان کرنے والے کو اس کا ''شعور'' ہے، نہ اس کو سننے والے جانتے ہیں کہ کہنے والے نے اصل میں کیا کہا ہے۔

۲۔ ہم یہاں اسلامی اور مغربی تہذیب کے تصادم کو رو رہے ہیں۔ مولانا فرما رہے ہیں کہ لا الہ الا اللہ میں موجود اعلانِ بغاوت کو ''کوئی بھی'' برداشت نہیں کرے گا۔ لیجیے مولانا نے تو بیٹھے بٹھائے ہمیں ساری دنیا سے لڑا دیا۔ لیکن مولانا نے یہ کہاں کہا ہے؟ مولانا نے فرمایا ہے آپ بس اس حقیقت کا اعلان کر دیں، دنیا خود ہی آپ سے لڑنے آجائے گی۔ مولانا نے پھر آگے چل کر حضورِ اکرمؐ کے زمانہ مبارک کی مثالیں دی ہیں اور آج ہم جانتے ہیں کہ الجزائر میں کیا ہوا اور فلسطین میں کیا ہو رہا ہے؟

۳۔ ذرا مولانا کی تحریر کے اقتباس کی آخری سطریں پھر پڑھیے۔ مولانا فرما رہے ہیں کہ ''یہ آواز بلند کرتے ہی زمین اور آسمان آپ کے دشمن ہو جائیں گے اور آپ کو محسوس ہوگا کہ آپکے ہر طرف سانپ، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں''۔

مولانا کی یہ بات صرف ان کا مطالعہ اور مشاہدہ نہیں ان کا ''تجربہ'' بھی تھی۔ آپ کہیں تو ہم ان سانپوں، بچھوؤں اور درندوں کے نام بھی آپ کو بتا دیں جنہوں نے مولانا پر حملہ کیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ مولانا نے جو بات کہی ہے، ویسا ہی تجربہ ہمیں سلیم احمد کی معرکہ آراء تنقیدی کتاب ''نئی نظم اور پورا آدمی'' میں موجود ایک نظم میں بھی ملتا ہے۔ سراج منیر کے بقول سلیم احمد

کے یہاں ''پورا آدمی'' ایک مابعد الطبیعاتی نظریہ ہے۔ مولانا مودودیؒ کے اقتباس کی آخری سطروں اور سلیم احمد کی نظم کی مماثلت ملاحظہ کیجیے:

پورا آدمی

اس کا شکوہ ہے تجھی سے اے خدائے بحر و بر
برسرِ پیکار اور مجھ سے ادھورے جانور
سر سے جو انسان کی صورت ہیں اور دھڑ سے مگر
سانپ، اژدھے، بھیڑیے، گدھے، بندر، سور

ہر طلسماتی بلا آتی ہے مُنھ کھولے ہوئے
دُور سے اُڑتی ہوئی گرنے کو پَر تولے ہوئے
اس کے سر کو دیکھ کے دھوکے میں رہتی ہے نظر
----- اے خدائے بحر و بر

سر مقدس، پاک، بزمِ آب و گِل کی روشنی
جسم انبارِ غلاظت، پست، بدفطرت ''دنی''
یہ تو سب کچھ ہے بجا، لیکن بحدِّ جاں کنی
افتراقِ جسم و سر کا کرب بھی ہے دیدنی

کرب، روحانی اذیت، روح کی پیہم جلن
اک سفر موہوم سا بے جادہ و منزل تھکن
سر کی زینت ہو گئے ایسے ہی کچھ رنگین پر
----- اے خدائے بحر و بر

سرِ مقدس، پاک، آبِ خُلد سے دھویا ہُوا
جسم بد آہنگ، ناپاکی میں ہے کھویا ہوا
مزرعِ بے حاصلی تفریق کا بویا ہوا
جس کے ہر خوشہ میں ایک عفریت ہے سویا ہوا

بے دلی، صد رنگ اکتاہٹ کی سنگیں بے حسی
یہ بلائیں اور ان میں تیرا پورا آدمی
سر سے پا تک آپ اپنے ہی لہو میں تربتر
----- اے خدائے بحر و بر

(نئی نظم اور پورا آدمی، صفحہ ۱۵)

مولانا مودودیؒ اظہارِ حق کر کے موت کی سزا تک پہنچے اور سلیم احمد نے پورے آدمی کی رزم گاہ میں کھڑے ہو کر تین ''نروس بریک ڈاؤن'' کمائے۔ مگر اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

ان باتوں سے قطع نظر ضرورت اس بات کی ہے کہ مولانا مودودیؒ کی فکر میں تہذیبوں کا جو تصادم برپا ہے، اسے ہم خود بھی دیکھیں اور دوسروں کو بھی دکھائیں۔ یہ کام نہایت آسان ہے۔ ایک قاری کالم کی دس فوٹو اسٹیٹ کرا کر تقسیم کر دے تو بات لاکھوں لوگوں تک پہنچ سکتی ہے۔ سنا ہے فی زمانہ اشتہاری زبان کا اثر لوگوں پر زیادہ ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں ٹی وی پر ایک اشتہار آتا تھا:

''خشکی کو بھول جایئے، گلوراپل کو یاد رکھیے''۔

ہماری اشتہاری کاپی یہ ہے:

''شاہنواز فاروقی کو بھول جایئے مولانا مودودیؒ کو یاد رکھیے''۔

تہذیبوں کا تصادم۔۔۔ مودودیؒ کی تحریروں کی روشنی میں

آیئے فکرِ مودودیؒ کی اس ہفتہ وار نشست میں چلتے ہیں جس کا مرکزی حوالہ مغربی فکر اور مغربی تہذیب کی تنقید ہے اور جس میں مولانا ہمیں بتاتے ہیں کہ اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے درمیان الف سے ے تک عدم مطابقت پائی جاتی ہے اور دونوں کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والا تصادم برپا ہے، اس لیے کہ مولانا کے بقول اسلامی تہذیب حق ہے اور جدید مغربی تہذیب جاہلیتِ خالصہ، شجرِ خبیث اور ثمرِ خبیث۔ لیکن آج کی نشست کے آغاز سے قبل یہ دیکھ لینے میں کیا مضائقہ ہے کہ مولانا ہمیں اب تک کیا بتا چکے ہیں۔ آج کے کالم کے نئے قارئین کے لیے بھی آموختہ پڑھ لینا مفید ہے۔ تو گزارش یہ ہے کہ مولانا اب تک درج ذیل امور میں تہذیبوں کی کامل عدم مطابقت یا تصادم دکھا چکے ہیں:

۱۔ الہیات	۲۔ تصورِ علم	۳۔ تصورِ تخلیق	۴۔ تصورِ قدر
۵۔ تصور کے اطلاقات	۶۔ تصورِ عقل	۷۔ مسئلۂ قومیت	

جیسا کہ ظاہر ہے یہ تصورِ آئسکریم، تصورِ برگر یا تصورِ روزگار اسکیم جیسے امور نہیں۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جنھیں کوئی معاشرہ اور کوئی تہذیب نظرانداز نہیں کر سکتی، خواہ وہ تہذیب مذہبی ہو یا سیکولر۔ بہر حال آیئے دیکھتے ہیں، آج مولانا تہذیبوں کے تصادم میں ہمیں اپنی بصیرت کے کن موتیوں سے مالا مال کر رہے ہیں۔

غور سے سنیے، مولانا تعلیم کے مسئلے پر اظہارِ خیال کر رہے ہیں، وہ فرمار ہے ہیں:

''انھوں نے اپنی تعلیم ہم پر مسلط کی اور اس طرح مسلط کی کہ رزق کی کنجیاں ہی لے کر اپنی تعلیم گاہوں کے دروازوں پر لٹکا دیں جس کے معنی یہ تھے کہ اب یہاں رزق وہی پائے گا جو یہ تعلیم حاصل کرے گا۔ اس دباؤ میں آ کر ہماری ہر نسل کے بعد دوسری نسل پہلے سے بڑھ چڑھ کر ان تعلیم گاہوں کی طرف گئی اور وہاں وہ سارے ہی نظریات اور عملیات سیکھے جن کی روح اور شکل

بالکل ہماری تہذیب کی ضد تھی۔ اگرچہ کھلا کافر تو وہ ہم میں سے ایک فی لاکھ کو بھی نہ بنا سکے، مگر فکر ونظر اور ذوق و وجدان اور سیرت و کردار میں ٹھیٹھ مسلمان انھوں نے شاید دو فیصدی کو بھی نہ رہنے دیا۔ یہ سب سے بڑا نقصان تھا جو انھوں نے ہم کو پہنچایا کیونکہ اس نے ہمارے دلوں اور دماغوں میں ہماری تہذیب کی جڑوں ہی کو خشک کر دیا اور ایک دوسری مختلف تہذیب کی جڑیں ان میں پیوست کر دیں''۔ (اسلامی نظامِ زندگی۔ صفحات ۴۵۲ اور ۴۵۳)

لیجیے مولانا نے مذکورہ بالا سات امور کے بعد آٹھویں امر میں بھی اسلامی اور مغربی تہذیب کو ایک دوسرے کی ضد قرار دے دیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا انھوں نے ایسا کرتے ہوئے سیموئل ہن ٹنگٹن سے اجازت لے لی تھی؟ ایک اور سوال یہ ہے کہ کیا مولانا نے تہذیبوں کا تصادم ثابت کرتے ہوئے قرآن وسنت کا مطالعہ کر لیا تھا؟ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے سیموئل ہن ٹنگٹن اس وقت بچہ تھا اور بچوں سے ایسے امور میں اجازت نہیں لی جاتی۔ نیز یہ کہ مولانا مودودیؒ جس وقت یہ سب فرمار ہے تھے تو دنیا انھیں مفسرِ قرآن کے طور پر جانتی تھی۔ توبہ توبہ کیسے رکیک سوالات اٹھا لیے گئے۔ خیر آگے بڑھیے اور دیکھیے مولانا جہاد کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں:

''اسلامی جہاد کا مقصود (Objective) غیر اسلامی نظامِ حکومت کو مٹا کر اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ اسلام یہ انقلاب صرف ایک ملک یا چند ملکوں میں نہیں بلکہ دنیا میں برپا کرنا چاہتا ہے۔ اگرچہ ابتداً مسلم پارٹی کے ارکان کا فرض یہی ہے کہ جہاں جہاں وہ رہتے ہوں، وہاں کے نظامِ حکومت میں انقلاب برپا کریں، لیکن ان کی آخری منزلِ مقصود ایک عالمگیر انقلاب کے سوا کچھ نہیں۔۔۔ حق جغرافیائی حدود کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ میں اگر کسی دریا یا پہاڑ کے اس پار حق ہوں تو اُس پار بھی حق ہوں۔ نوعِ انسانی کے کسی حصے کو بھی مجھ سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔ انسان جہاں بھی ظلم وستم کا اور افراط وتفریط کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے، اس کی مدد کے لیے پہنچنا میرا فرض ہے۔ اس تخیل کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

'تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں ان مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے نہیں لڑتے جنھیں کمزور پا کر دبا لیا گیا ہے اور جو دعائیں مانگتے ہیں کہ خدایا ہمیں اس بستی سے نکال جس کے

باشندے ظالم ہیں'۔(النساء:۷۵)

۔۔۔علاوہ ازیں قومی و مسلکی تقسیمات کے باوجود انسانی تعلقات اور روابط کچھ ایسی عالمگیری اپنے اندر رکھتے ہیں کہ کوئی ایک مملکت اپنے اصول و مسلک کے مطابق پوری طرح عمل نہیں کرسکتی جب تک کہ ہمسایہ ممالک میں بھی وہی اصولِ و مسلک رائج نہ ہو جائے۔لہٰذا مسلم پارٹی کے لیے اصلاحِ عمومی اور تحفظِ خودی دونوں کی خاطر یہ ناگزیر ہے کہ کسی ایک خطے میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے پر اکتفانہ کرے بلکہ جہاں تک اس کی قوتیں ساتھ دیں، اس نظام کو تمام اطرافِ عالم میں وسیع کرنے کی کوشش کرے۔ وہ ایک طرف اپنے افکار ونظریات کو دنیا میں پھیلائے گی۔۔۔اور دوسری طرف اگر اس میں طاقت ہوگی تو وہ لڑکر غیر اسلامی حکومتوں کو مٹادے گی اور ان کی جگہ اسلامی حکومت قائم کرے گی''۔(تفہیمات۔صفحہ۷۲اور۷۳)

مولانا مودودیؒ کمال کرتے ہیں۔توحید کے اصول کا اعلان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ آپ شعور کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہہ کر دیکھیے، دنیا خود آپ سے لڑنے آجائے گی۔زمین و آسمان آپ کے دشمن ہوجائیں گے اور سانپ اور بچھو آپ پر حملہ کر دیں گے۔اور یہاں وہ فرما رہے ہیں کہ جہاد کا مقصود غیر اسلامی نظام کو مٹانا ہے۔اور اگر مسلم پارٹی کے پاس طاقت ہوگی تو وہ طاقت کے ذریعے یہ کام کرگزرے گی۔ظاہر ہے کہ یہ باتیں تو ہرگز امریکا اور یورپ کو خوش کرنے والی نہیں۔کیا مولانا ایسی باتیں نہیں کرسکتے جن سے تہذیبوں کے تصادم کی بُو نہ آتی ہو اور امریکی سی آئی اے اور برطانیہ کی ایم آئی۔٦ کو خوش کیا جاسکتا ہو؟ یا اللہ اب ہمارے امریکا اور برطانیہ کے ویزوں کا کیا بنے گا؟ آیئے مولانا کی فکر اور تحریروں کو کہیں چھپادیں۔ان پر کوئی پردہ ڈال دیں۔مولانا مودودیؒ؟ کون مولانا مودودیؒ؟ یہ نام سنا ہوا سا لگتا ہے۔جی جی وہی مولانا جنھوں نے اسلامی اور مغربی تہذیب کے ملاپ، امتزاج، معانقے، مطابقت، بغل گیری اور سنگم وغیرہ پر کئی یادگار کتابیں چھوڑی ہیں۔(باقی کل)

تہذیبوں کا تصادم، مولانا مودودیؒ کی تحریروں کی روشنی میں

مولانا مودودیؒ کی تحریروں میں بڑی شخصیتوں کے دو اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے: ایک پیش گوئی اور دوسرا تادیر زندہ رہنے کی اہلیت یعنی Relevance۔ مولانا نہ صرف یہ کہ اپنے زمانے میں تہذیبوں کے تصادم کے ناظر، گواہ اور مبصر تھے بلکہ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ تصادم مرحلہ بہ مرحلہ آگے بڑھتے ہوئے کیا نتائج پیدا کرے گا۔ آیئے مولانا کی تحریروں سے ایک اقتباس پڑھیں اور (اپنا) سر دھنیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام کی اکثریت یا تو قلتِ فہم کے باعث یا کم ہمتی کے سبب سے یا پھر اپنی نااہلی کے اندرونی احساس کی وجہ سے دین و دنیا کی اس تقسیم پر راضی ہو چکی ہے جس کا تخیل اب سے مدتوں پہلے عیسائیوں سے مسلمانوں کے ہاں درآمد ہوا تھا۔ انھوں نے چاہے نظری طور پر اسے پوری طرح نہ مانا ہو مگر عملاً وہ اسے تسلیم کر چکے ہیں کہ سیاسی اقتدار اور دنیوی ریاست وقیادت غیر اہلِ دین کے ہاتھ میں رہے۔ چاہے یہ محدود دنیا بے دین سیاست و قیادت کی مسلسل تاخت سے روز بروز سکڑ کر کتنی ہی محدود ہوتی چلی جائے۔ اس تقسیم کو قبول کر لینے کے بعد یہ حضرات اپنی تمام تر قوت دو باتوں پر صرف کر رہے ہیں۔

ایک اپنی محدود مذہبی ریاست کی حفاظت جس کے مسائل اور معاملات میں کسی کی مداخلت انھیں گوارا نہیں ہے۔ دوسرے کسی ایسی بے دین قیادت سے گٹھ جوڑ مذہب کے محدود دائرے میں ان کی اجارہ داری کی بقا کی ضمانت دے دے اور اس دائرے سے باہر کی دنیا میں جس فسق اور ضلالت کو چاہے فروغ دیتی رہے۔ اس طرح کی ضمانت اگر کسی قیادت سے انھیں مل جائے تو یہ دل کھول کر اُس کا ساتھ دیتے ہیں اور خود جان لڑا کر اسے قائم کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے، خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ کفر والحاد اور فسق وضلالت تمام سیاسی و معاشی اور تہذیبی قوتوں پر قابض ہو کر پورے دین کی جڑیں ہلا دے اور اس محدود مذہبیت کے پنپنے کے امکانات

بھی باقی نہ رہنے دے جس کی ریاست اپنے لیے محفوظ رکھنے کی خاطر یہ لوگ اس قدر پاپڑ بیل رہے ہیں‘‘۔ (رسائل ومسائل۔ جلد دوم۔ صفحہ ۴۹۹ اور ۵۰۰)

گستاخی معاف، یہاں ہمیں علامہ اقبال کا ایک شعر یاد آ گیا۔ اقبال نے ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں ایک شیطان کی زبان سے کہلوایا ہے:

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملّا ملوکیت کے ہیں بندے تمام

آیئے اب اس اقتباس کا تھوڑا سا تجزیہ کرلیں۔ اس اقتباس میں مولانا نے اسلامی تہذیب پر مغربی تہذیب کے صرف اس اثر کی نشاندہی نہیں کی جس کے تحت ہمارے یہاں مذہب اور سیاست کی تفریق قائم ہوئی بلکہ مولانا نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ جو لوگ اس تقسیم کو قبول کر رہے ہیں، ان کا مسئلہ کیا ہے، ان کی نفسیات کیا ہے، ان کا مفاد کیا ہے۔ یہ تو ہوا اس اقتباس کا تاریخی پہلو۔ لیکن اس اقتباس کا دوسرا پہلو ہمارے ’’آج‘‘ سے متعلق ہے۔

جنرل پرویز اور ان کے حواری جس طرح امریکا اور یورپ کے اشارے پر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا رہے ہیں، وہ سامنے کی بات ہے، یہاں تک کہ اب تو وہ نصوص میں ترامیم کے گناہِ عظیم کے بھی مرتکب ہو چکے۔ بلاشبہ معاشرے نے اسے قبول نہیں کیا۔ لیکن اسے جس طرح مسترد کیا جانا چاہیے تھا، اس طرح مسترد بھی نہیں کیا۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ جو علماء خودکش حملوں پر فتویٰ دیتے ہیں، انھوں نے ابھی تک نصوص کو چیلنج کرنے پر فتویٰ نہیں دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی سبب ہوگا۔ ممکن ہے اس کی کوئی ایسی مصلحت بھی ہو جو ہم جیسے لاعلموں اور کم فہموں کو معلوم نہ ہو۔ لیکن مولانا کی بصیرت ہمیں بتا رہی ہے کہ اگر اس طرح حالات کو قبول کیا جاتا رہا تو ممکن ہے کہ دین کی جڑیں ہی ہلا دی جائیں اور جو لوگ ایک ’’محدود مذہبی ریاست‘‘ کو بچانا چاہتے ہیں، وہ اور اس کی علامت کا درجہ رکھنے والی مذہبیت بھی باقی نہ رہے۔ آخر گزشتہ پانچ سال میں جو کچھ ہو چکا ہے، اس کی توقع کس کو تھی؟ کم از کم ان لوگوں کو تو ہرگز نہیں تھی جن کا ذکرِ خیر یہاں ہو رہا ہے۔ بہرحال تہذیبوں کے تصادم اور اس کے مضمرات میں مولانا کی یہ رہنمائی ’’سب کو‘ مفت

فراہم ہے۔ لیکن مولانا کی فکر کا کمال تو دیکھیے۔ مولانا کی مذکورہ تحریر اُس وقت اتنی Relevent نہیں تھی جتنی آج ہے۔ مولانا کی یہ تحریر نہیں ایک آئینہ ہے۔ صاف شفاف۔ جو جیسا ہے، اُسے ویسا دکھاتا ہے۔ تو اب مولانا کی فکری میراث کے پس منظر میں سوال یہ ہے کہ درست کون ہے؟ تہذیبوں کے تصادم کے منکر اور اس پر پردہ ڈالنے والے؟ یا لوگوں کو بھولا ہوا تاریخی سبق یاد دلانے والے؟ خیر اس معاملے کو یہیں رہنے دیتے ہیں۔ مولانا کی تحریریں خود ہر چیز کا تعین کرتی جا رہی ہیں۔ آئیے مولانا کی ایک نایاب تحریر ملاحظہ کرتے ہیں۔ مولانا نے لکھا ہے:

''آپ کو یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام میں جس فرض کا جو وقت ہے، اس وقت اس فرض کو ادا کرنا لازم ہے۔ دوسری کوئی بڑی سے بڑی نیکی بھی اس کے بدلے قبول نہیں کی جاتی۔ مثلاً روزوں کے لیے جو زمانہ رکھا گیا ہے، اس میں آپ کو روزہ رکھنا ہوگا۔ اگر آپ اپنی ساری دولت بھی خدا کی راہ میں لٹا دیں تو وہ ایک روزے کا بھی بدل نہ ہو سکے گی۔ اسی طرح یہ وقت اس فرض کو انجام دینے کا ہے کہ شر اور فسق و فجور اور ظلم و ستم کی طاقتوں کے مقابلے میں آپ اپنی ساری قوتیں صرف کر دیں اور ان کو شکست دینے کے لیے اپنا پورا زور لگا دیں۔ اس فرض کو چھوڑ کر اگر آپ اپنے سارے دن روزے رکھنے میں اور ساری راتیں نفل پڑھنے میں صرف کر دیں تو کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی اور کسی چیز کا اجر نہ ملے گا۔ پھر آپ خود ہی سمجھ لیجیے کہ جب اس فرض کی ادائیگی کے وقت نفل عبادتیں تک مقبول نہیں ہیں تو اپنے دنیوی کاروبار میں لگے رہنے اور فیصلے کے وقت اپنی طاقتیں خیر کے پلڑے میں لا کر نہ ڈال دینے پر خدا کے ہاں کیسی باز پرس ہوگی''۔ (ذکریٰ ڈائجسٹ۔ رام پور، بھارت۔ مئی ۱۹۷۷ء۔ صفحہ ۵۶ اور ۵۷)

تہذیبوں کا تصادم۔۔۔ مودودیؒ کی تحریروں کی روشنی میں

دوسری اور آخری قسط

آپ مولانا کی تصنیف ''مسئلۂ قومیت'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کر چکے لیکن اس موضوع پر ہمارے پاس مولانا کی ایک ایسی تحریر بھی ہے، جو اس معاملے سے کم لوگوں کی نظر سے گزری ہوگی کہ یہ تحریر پاکستان میں شائع نہیں ہوئی۔ تحریر اور اس کا حوالہ ملاحظہ فرمائیے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''اس امر میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ نیشنلزم اور اسلام دو بالکل الگ دو قطعی متضاد ذہنیتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان دونوں کا ایک جگہ جمع ہونا محالات سے ہے۔ درحقیقت نیشنلزم خود ایک مذہب ہے جو شرائع الٰہیہ کا مخالف ہے، بلکہ علمی حیثیت سے بھی انسان کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں پر ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے جنہیں شرائع الٰہیہ اپنی گرفت میں لینا چاہتی ہے۔ اب ایک مردِ عاقل کے لیے صرف یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ دل و دماغ اور جسم و جان کا مطالبہ کرنے والے ان دونوں مدعیوں میں سے کسی ایک کو پسند کر کے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے اور جب ایک کی آغوش میں چلا جائے تو دوسرے کا نام تک نہ لے۔ بلاشبہ مسلمانوں کے اندر بھی اسلام کی پوری پیروی نہ کرنے کے باعث بارہا لڑائیاں پیش آئی ہیں۔ غیر مسلموں سے بارہا ان کا مقابلہ ہوا ہے۔ دنیا کے بہت سے ملک انھوں نے بھی فتح کیے ہیں لیکن اگر کوئی شخص انصاف کی نظر سے دیکھے تو اسے نظر آ سکتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر کبھی نیشنلزم کا وہ اندھا جنون پیدا نہیں ہوا جو مغربی دنیا میں پایا جاتا ہے اور مسلمانوں نے کبھی مفتوحوں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو اہلِ مغرب نے کیا ہے۔ اسپین کو کبھی مسلمانوں نے فتح کیا تھا اور پھر عیسائیوں نے بھی اسے مسلمانوں سے چھینا۔ دونوں فتوحات کے نتائج ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے۔ فلسطین اور بیت المقدس کبھی مسلمانوں سے بھی چھینے گئے تھے اور کبھی مسلمانوں نے بھی ان کو واپس لیا تھا۔ دونوں کا فرق آخر کس کو معلوم نہیں ہے؟ اس فرق کی وجہ تلاش کیجیے۔ کیا اس کی وجہ

اس کے سوا بتائی جاسکتی ہے کہ اسلام نے اپنے پیرو انسانوں کو اس قدر وسیع القلب، اس قدر فیاض اور اس قدر غیر قوم پرست بنا دیا ہے جس کے باعث وہ فتحیاب ہونے کے بعد مفتوح قوم کے ساتھ کبھی وہ سلوک نہیں کرتے جو دوسرے لوگ کرتے ہیں اور ان کے اندر قومیت کا وہ جنون کبھی پیدا نہیں ہوتا جو اپنی قوم کے سوا انسان کو ہر دوسری قوم کا دشمن بنا دیتا ہے۔ اسلام کی ان تعلیمات کو کھلے دل سے دیکھنا چاہیے جن کی بدولت مسلمانوں کو یہ نعمت حاصل ہوئی ہے۔ اگر ان کے اندر کوئی بھلائی پائی جائے۔ اگر ان کے اندر کوئی روشنی نظر آئے تو آخر کیوں نہ اس سے رہنمائی حاصل کی جائے؟ انسان خود اپنا دشمن ہوگا اگر کہیں اُسے داروئے شفا ملتی ہو تو وہ صرف اس لیے اس کو لینے سے انکار کردے کہ یہ اس کے ہاں کی چیز نہیں''۔ (ماہنامہ زندگی۔ رامپور۔ بھارت۔ اپریل ۱۹۶۲ء۔ صفحہ ۲۰۔ ۲۱)

مولانا کی تحریروں میں آپ اسلام میں عقل کے مقام اور مغربی تہذیب میں عقل کے تصور کی عدم مطابقت ملاحظہ کر چکے۔ اس وقت آپ وحی کے مقابلے میں عقلی استدلال کی نارسائی ملاحظہ کیجیے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''جہاں تک عقلی استدلال کا تعلق ہے وہ ہم کو صرف ''ہونا چاہیے'' کی حد تک لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا واقعی کوئی ایسا علم ہے بھی، تو ہماری عقل اور ہمارا علم دونوں اس کا حکم لگانے سے عاجز ہیں۔ یہاں قرآن ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل اور فطرت جس چیز کا مطالبہ کرتی ہے۔ فی الواقع وہ ہونے والی ہے۔ موجودہ نظامِ عالم جو طبعی قوانین پر بنا ہے، ایک وقت میں توڑ ڈالا جائے گا، اس کے بعد ایک دوسرا نظام بنے گا جس میں زمین و آسمان اور ساری چیزیں ایک دوسرے ڈھنگ کی ہوں گی''۔ (اسلامی زندگی۔ صفحہ ۶۴)

اور اب ملاحظہ کیجیے مولانا کا ایک ایسا تبصرہ جو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی فکر پر مغربی تہذیب کے گہرے ناپسندیدہ اثر کی علامت ہے بلکہ جو ۴۰ سال پرانا ہونے کے باوجود اتنا نیا ہے جیسے آج لکھا گیا ہو۔ اس اقتباس کا عنوان وفاداری اور کرائے کے فوجی کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ مولانا نے لکھا ہے:

''ایک اور بیماری جو اس زمانے میں پیدا ہوئی اور پھر برابر بڑھتی چلی گئی، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر سے تمام وفاداریاں ختم ہو گئیں اور صرف اپنی ذاتی وفاداری اور اپنے کنبے کی وفاداری رہ گئی۔ اسلام نے پہلے ساری وفاداریاں نکال دی تھیں۔ اس کے بعد انگریز آئے اور یہیں سے انھوں نے کرائے کے سپاہی فراہم کیے اور یہیں کے سپاہیوں سے انھوں نے اس ملک کو فتح کیا۔ ان کو باہر سے بہت زیادہ فوج نہیں لانی پڑی۔ یہیں ان کو ملک فتح کرنے والے بھی مل گئے اور یہیں سے مفتوح ملک کا انتظام چلانے والے بھی مل گئے۔ کسی کے اندر یہ احساس ہی نہ تھا کہ ہم کس کے لیے کس ملک کو فتح کر رہے ہیں اور کس کے لیے ملک کا نظم ونسق چلانے کو تیار ہو رہے ہیں۔ اس لیے کہ ساری وفاداریاں ختم ہو چکی تھیں۔ ایک آخری وفاداری اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کے دین کی تھی، اس کو ختم کر دیا گیا تھا۔ آخر کار جو چیز باقی رہ گئی، وہ صرف نفس کی وفاداری تھی اور نفس کی وفاداری ہی آدمی کو ایسے کاموں پر آمادہ کر سکتی ہے''۔ (ماہنامہ تجلی دیو بند۔ فروری، مارچ ۱۹۶۷ء۔ صفحات ۴۴ اور ۴۵)

مولانا کی تین تحریروں کے تین اقتباسات آپ نے ملاحظہ کیے۔ ان سے کیا برآمد ہو رہا ہے اور کیا برآمد نہیں ہو رہا۔ غالباً اس پر گفتگو کی بھی ضرورت نہیں، آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔

مولانا کی مغرب سے متعلق فکر کے اس اجتماعی مطالعے کا یہ فائدہ ہونا شروع ہو گیا ہے کہ جن لوگوں نے عرصے سے مولانا کو نہیں پڑھا تھا، انھوں نے مولانا کو دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ اس میں ۲۰ سال کے نوجوان بھی ہیں اور ۲۵ سال کے بوڑھے بھی اور ایسا کیوں نہ ہو۔ ہم مولانا کو نہیں پڑھیں گے تو خود کو بھی بھول جائیں گے اور مغرب کے کھلے اور خفیہ ایجنٹوں کا کام آسان ہو جائے گا۔ یہ نشست ان شاء اللہ آئندہ ہفتے بھی آراستہ ہو گی۔

تہذیبوں کا تصادم۔۔۔مودودیؒ کی بیشتر تحریروں کی روشنی میں (۳)

جدید مغربی تہذیب نے مذہب کے خلاف بغاوت کی اور خدا مرکزِ کائنات کی جگہ انسان مرکزِ کائنات ''ایجاد'' کی۔ اس نئی کائنات کے جھوٹے خدا کی سب سے بڑی فضیلت (جزوی) عقل یا Reason قرار پائی۔ آیئے دیکھتے ہیں مولانا اس بارے میں کیا فرماتے ہیں:

''خدا کی بندگی تو انسان آپ سے آپ، بلا عمد و اختیار، بغیر جانے بوجھے کر ہی رہا ہے اور ٹھیک اسی طرح کر رہا ہے جس طرح لاعقل، بے شعور درخت، بے جان پتھر کر رہے ہیں۔ اس حیثیت سے اس میں اور دوسری مخلوقات میں کوئی فرق نہیں۔۔۔ بجائے خود عقل اور قوتِ علمیہ میں کوئی شرف اور برتری نہیں ہے۔ یہ تو محض حصولِ شرف کے لیے ایک آلہ ہے اور اس آلے نے انسان کو یہ استعداد بہم پہنچادی ہے کہ اس سے ٹھیک ٹھیک کام لے کر وہ بندگی اضطراری کے میدانی مقام سے ترقی کر کے عبادتِ اختیاری کے انسانی مقام پر پہنچ سکے۔ لیکن اگر انسان نے اس آلے سے غلط کام لیا اور اس کو چھوڑ کر جس کا وہ بندہ ہے، ان کی عبادت اختیار کی جن کا فی الحقیقت وہ بندہ نہیں ہے تو وہ حیوانی مقام سے بھی نیچے اتر گیا۔ حیوان گمراہ تو نہ تھا، یہ گمراہ ہوا۔ حیوان منکر تو نہ تھا، یہ منکر ہوا۔ حیوان کافر و مشرک تو نہ تھا۔ یہ کافر و مشرک ہو گیا۔ حیوان جس مقام پر پیدا کیا گیا، اس مقام پر وہ قائم رہا اور حیوان ہونے کی حیثیت سے یہ بھی اسی مقام پر ہے مگر انسان ہونے کی حیثیت سے جو ترقی اس کو کرنی چاہیے تھی، وہ اس نے نہ کی بلکہ الٹا تنزل کی طرف چلا گیا۔ ترقی کے لیے اس کو جو عقل کا آلہ دیا گیا تھا، اس کو اس نے انسانی ترقی کے لیے استعمال نہ کیا بلکہ حیوانیت میں ترقی کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اس نے دوربین بنائی کہ حیوان جتنی دور کی چیز دیکھ سکتا ہے، اس سے زیادہ دور کی چیز یہ دیکھ سکے۔ اس نے ریڈیو ایجاد کیا کہ حیوان جتنی دور کی آواز سن سکتا ہے، اس سے زیادہ دور کی آواز سن سکے۔ اس نے ریل اور موٹر بنائی کہ حیوان جس قدر قطعِ مسافت کر سکتا ہے، اس سے زیادہ کر سکے۔ اس نے ہوائی جہاز بنائے

کہ اڑنے میں پرندوں سے بازی لے جائے، اس نے بحری جہاز بنائے کہ تیرنے میں مچھلیوں کو مات کردے۔ اس نے آلاتِ حرب بنائے کہ لڑنے میں درندوں سے سبقت لے جائے۔ اس نے عیش وعشرت کے سامان فراہم کیے کہ جانوروں سے زیادہ پُر لطف زندگی بسر کرے۔ مگر کیا ان ترقیات کے باوجود یہ مقامِ حیوان سے کچھ بھی بلند ہوا؟ عقل وعلم کے ذریعے سے عالمِ مادی میں جتنے تصرفات یہ کررہا ہے، وہ سب کے سب الٰہی قوانینِ فطرت کے ماتحت تو ہیں جن کے تحت عقل وفہم کے بغیر حیوانات ایک محدود پیمانے پر ایسے ہی تصرفات کرتے ہیں۔ پس یہ تو وہی بندگی اضطراری کا مقام ہوا جس میں حیوان ہے''۔ (تفہیمات، جلد اول، صفحہ ۵۰ اور ۵۱)

اسلامی تہذیب پر دوسری تہذیبوں کے جو گہرے اثرات مرتب ہوئے، مولانا کے یہاں ان کا ذکر ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا نے ایک جگہ لکھا ہے:

''جو شخص تہذیبِ اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا، اسے یہ بات نمایاں طور پر محسوس ہوگی کہ اس میں جب تک خالص اسلامیت رہی، اُس وقت تک یہ ایک خالص عملی تہذیب تھی۔۔۔ بعد میں جب اسلامیت کا اثر کم ہوگیا اور دوسری تہذیبوں سے متاثر ہوکر مسلمانوں کی سیرت میں پوری اسلامی شان باقی نہیں رہی تو انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو دنیوی زندگی کے اسلامی تصور کے خلاف تھا۔ عیش وعشرت میں منہمک ہوئے، عالیشان قصر تعمیر کیے، موسیقی، مصوری، سنگ تراشی اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں دلچسپی لی اور طرزِ بود وماند میں اُس اسراف اور اس شان وشوکت کو اختیار کیا جو اسلامی مذاق کے بالکل خلاف تھی''۔ (اسلامی تہذیب، صفحہ ۶۳ اور ۶۴)

تصورِ انسان کی بحث کسی بھی تہذیب کی بنیادی بحث ہے اور ہر تہذیب یہ بحث قائم کرکے انسان کی تعریف متعین کرتی ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی تہذیب کا تصورِ انسان یہ ہے کہ انسان روح، نفس اور جسم کا مرکب ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے۔ اس کے برعکس جدید مغربی تہذیب انسان کو صرف جسمانی وجود مانتی ہے۔ اس حوالے سے مولانا کی رائے ملاحظہ کیجیے:

''انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک حقیر مخلوق ہے مگر اس کو جو عزت حاصل ہوئی ہے، وہ

اس روح کی بنا پر ہے جو اس میں پھونکی گئی ہے اور اس نیابتِ الٰہی کی بنا پر ہے جو اسے زمین میں عطا کی گئی ہے۔ لیکن اگر وہ نیابت کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا اور خدا کی ہدایت پر نہ چلے گا تو ملکوتی طاقتیں اس کا ساتھ چھوڑ دیں گی، کیونکہ اس طرح وہ خود اپنے منصبِ نیابت سے دست بردار ہو چکا ہوگا، اور جب اس کا ساتھ دینے والی کوئی طاقت نہ رہے گی اور وہ محض مٹی کا پتلا رہ جائے گا تو شیطانی قوتیں اس پر غالب آ جائیں گی۔ پھر شیطان اور اس کے لشکر ہی اس کے حمایتی اور مددگار ہوں گے، انہی کے احکام کی وہ پیروی کرے گا اور انہی کا سا انجام اس کا بھی ہوگا''۔ (اسلامی تہذیب کے اصول ومبادی، صفحہ ۳۰ اور ۳۱)

مولانا مودودیؒ نے مغربی فکر اور مغربی تہذیب کی جو اساسی تنقید لکھی، اس میں مولانا کی کتاب ''مسئلۂ قومیت'' کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ ذرا دیکھیے تو مولانا اس کتاب میں کیا فرمارہے ہیں:

''آج مغربی قوموں سے سبق سیکھ کر ہر جگہ کے مسلمان نسلیت اور وطنیت کے راگ الاپ رہے ہیں۔ عرب عربیت پر ناز کر رہا ہے، مصری کو اپنے فراعنہ یاد آ رہے ہیں، ترک اپنی ترکیت کے جوش میں چنگیز خاں اور ہلاکو سے رشتے جوڑ رہا ہے، ایرانی اپنی ایرانیت کے جوش میں کہتا ہے کہ یہ محض عرب امپیریلزم کا زور تھا کہ حسین اور علی ہمارے ہیرو بن گئے حالانکہ حقیقت میں ہمارے قومی ابطال تو رستم اور اسفندیار تھے۔ ہندوستان میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو اپنے آپ کو ہندوستانی قومیت سے منسوب کرتے ہیں، وہ لوگ بھی یہاں موجود ہیں جو آبِ زم زم سے قطع تعلق کر کے آبِ گنگا سے وابستگی پیدا کرنا چاہتے ہیں، ایسے لوگ بھی ہیں جو بھیم اور ارجن کو اپنا قومی ہیرو قرار دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ ان نادانوں نے نہ اپنی تہذیب کو سمجھا ہے اور نہ مغربی تہذیب کو۔ اصول اور حقائق ان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ وہ محض سطح بیں ہیں اور سطح پر جو نقوش ان کو زیادہ نمایاں اور زیادہ خوش رنگ نظر آتے ہیں، انہی پر لوٹ پوٹ ہونے لگتے ہیں۔ ان کو خبر نہیں کہ جو چیز مغربی قومیت کے لیے آبِ حیات ہے، وہی چیز اسلامی قومیت کے لیے زہر۔ مغربی قومیتوں کی بنیاد نسل و وطن اور زبان و رنگ کی وحدت پر قائم ہوتی ہے۔ ایک ہندی مسلمان مصر کا ویسا ہی وفادار شہری بن سکتا ہے جیسا کہ وہ خود

ہندوستان کا ہے۔ ایک افغانی مسلمان شام کی حفاظت کے لیے اسی جانبازی کے ساتھ لڑ سکتا ہے جس کے ساتھ وہ خود افغانستان کے لیے لڑتا ہے۔ اس لیے ایک ملک کے مسلمان اور دوسرے ملک کے مسلمان میں جغرافی یا نسلی تفریق کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس معاملے میں اسلام کے اصول اور مغرب کے اصول ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔ جو وہاں سببِ قوت ہے، وہ یہاں عین سببِ ضعف ہے، اور جو یہاں مایۂ حیات ہے، وہ وہاں بعینہٖ سمِ قاتل ہے۔

بعض لوگ اس خیالِ خام میں مبتلا ہیں کہ وطنی یا نسلی قومیت کے احساسات پیدا ہونے کے بعد بھی اسلامی قومیت کا رشتہ مسلمانوں کے درمیان باقی رہ سکتا ہے، اس لیے وہ اپنے نفس کو یہ کہہ کر دھوکا دیتے ہیں کہ یہ دونوں قسم کی قومیتیں ساتھ ساتھ چلیں گی، ایک سے دوسرے پر آنچ نہ آئے گی اور ہم ان دونوں کے فوائد جمع کر لیں گے۔ لیکن یہ محض جہل اور قلتِ فکر کا کرشمہ ہے۔ جس طرح خدا نے ایک سینے میں دو قلب نہیں رکھے، اسی طرح ایک قلب میں دو قومیتوں کے متضاد اور متصادم جذبات کو جمع کرنے کی گنجائش بھی نہیں رکھی ہے۔ احساسِ قومیت کا لازمی نتیجہ اپنے اور غیر کا امتیاز ہے۔ اسلامی قومیت کے احساس کا اقتضا یہ ہے کہ آپ مسلم کو اپنا اور غیر مسلم کو غیر سمجھیں۔۔۔(بہر حال) بہتر ہے کہ (ہم) اپنے آپ کو دھوکا نہ دیں بلکہ جو کچھ کریں، یہ جان کر کریں کہ وطنی قومیت کی دعوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی عین ضد ہے''۔

(مسئلہ قومیت، صفحہ ۴۷ تا ۵۰)

آپ نے دیکھا مولانا مودودیؒ کے یہاں تہذیبوں کا تصادم صرف ''تنقیحات'' ہی میں برپا نہیں جس کے حوالوں کی بنیاد پر کچھ عرصہ قبل ہم نے چار قسطیں سپردِ قلم کی تھیں بلکہ مولانا کے یہاں یہ مسئلہ بہت پھیلاؤ رکھتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ موجودہ صرف تین قسطوں میں مولانا کی پانچ کتب یا پانچ تحریروں کے حوالے آ گئے۔ طے شدہ طریقہ کار کے مطابق یہ موضوع آئندہ جمعہ اور ہفتہ کو پھر زیرِ بحث آئے گا۔

مولانا مودودیؒ کی حیرت انگیز تحریریں

آج ضرورت کے تحت کالم کا عنوان بدل لیا ہے مگر اس سے قطع نظر مسئلہ یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ کو دوبارہ پڑھنا تو قیامت ہوگیا، ہم تہذیبی تصادم کا ایک حوالہ تلاش کرتے ہیں، چار مل جاتے ہیں۔ ان میں کچھ حوالے تو خود ہمارے لیے بھی نئے ہیں۔ آج کے کالم میں کم از کم دو حوالے تو ایسے ہیں جو شاید ہی کسی کو یاد ہوں۔ بلکہ دعوے سے کہا جاسکتا ہے کہ انھیں پڑھا بھی دس بیس لوگوں نے ہوگا۔ ملاحظہ کیجیے مولانا کی تحریر کا پہلا حوالہ:

''یہ مقالہ اُن لوگوں کی غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے لکھا گیا ہے جو اسلامی تہذیب کو داڑھی مونچھ کی مخصوص تراش اور پاجامے اور لوٹے کے ایک خاص انداز سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے''۔ (ادبیاتِ مودودی۔ مرتب: پروفیسر خورشید احمد۔ صفحہ ۲۰۷۔ سن اشاعت ۱۹۷۲ء)

زیرِ بحث موضوع کے حوالے سے ایسا ہی فقرہ ہمارے ذہن میں تھا۔ دوستوں کی مجلسوں میں اس کا ذکر بھی ہوا مگر ہم نے اسے لکھا نہیں۔ مولانا کے یہاں یہی فقرہ دیکھا تو ہم حیران رہ گئے۔ مگر مولانا کے اس فقرے کو مزید کھولنے کی ضرورت ہے۔

مولانا کی یہ تحریر مئی، جون ۱۹۴۴ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوئی اور محترم خورشید صاحب نے اسے ادبیاتِ مودودیؒ میں دوبارہ شائع کیا۔ مگر اس فقرے میں مولانا نے فرمایا کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا یہ ہے کہ بعض لوگوں کا تصورِ تہذیب لباس اور وضع قطع سے آگے نہیں جاتا۔ یعنی ان بے چاروں کو معلوم ہی نہیں کہ تہذیب کی ایک الٰہیات یا Ontology بھی ہوتی ہے۔ تہذیب کا ایک تصورِ علم یا Epistimology بھی ہوتی ہے۔ اس کا ایک تصورِ انسان، تصورِ تخلیق، تصورِ ترقی و زوال بھی ہوتا ہے۔ یہی تصورات تہذیب کی اصل بنیاد اور اس کی اصل روح ہوتے ہیں اور ان سے تہذیب کے مظاہر بھی جنم لیتے ہیں۔ ہم مولانا کی تحریروں سے یہ امور نکال کر آپ کی خدمت میں پیش کر چکے۔ لیکن مذکورہ اقتباس سے اس بحث کا ایک نیا زاویہ سامنے آیا۔ یہاں

یاد رکھنا چاہیے کہ مولانا نے یہ نہیں کہا کہ لباس، وضع قطع اور لوٹا تہذیبی مظاہر نہیں ہیں۔ مولانا نے صرف یہ کہا ہے کہ بعض لوگوں کا تصورِ تہذیب ان چیزوں سے آگے نہیں جاتا۔ آپ چاہیں تو اسے تہذیب کا پاجامائی، یا لوٹائی تصور کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اب ذرا دل تھام کر آگے بڑھیے۔ مولانا نے ایک تحریر میں اشتراکیت اور مغربی تہذیب پر تنقید کی ہے اور پھر لکھا ہے:

''جماعت اسلامی کا اصل تصادم انہی دو طاقتوں سے ہے۔ علماء کرام خواہ مخواہ بیچ میں آ کھڑے ہوئے ہیں۔ یا ''کوریا'' بنا کر لا کھڑے کیے گئے ہیں''۔ (جماعت اسلامی، اس کا مقصد اور لائحہ عمل۔ صفحہ ۸۳۔ بحوالہ ادبیات مودودیؒ۔ مرتب: پروفیسر خورشید احمد۔ صفحہ ۹۵)

لیجیے یہاں مولانا مودودیؒ نے جماعت اسلامی کے دو حریفوں کا تعین کر دیا اور یہ بھی فرما دیا کہ ہمارا ان سے تصادم ہے۔ ادبیاتِ مودودیؒ ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ چنانچہ مولانا کا مذکورہ اقتباس یقیناً اس سے پہلے کا ہے۔ مگر وہ سیموئل ہن ٹنگٹن اور اس کا تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ ۱۹۹۶ء میں معروف ہوا؟ بیچارہ سیموئل ہن ٹنگٹن۔ اور اب مولانا کا تیسرا اقتباس۔ مولانا فرماتے ہیں:

''اسلام کے ساتھ مغربی تہذیب کا تصادم جن حالات میں پیش آیا ہے، وہ اُن حالات سے بالکل مختلف ہیں جن میں اس سے پہلے اسلام اور دوسری تہذیبوں کے درمیان تصادم ہوئے ہیں۔ رومی، فارسی، ہندی اور چینی تہذیبیں اُس وقت اسلام سے ٹکرائیں جب اسلام اپنے متبعین کی فکری و عملی قوتوں پر پورے زور کے ساتھ حکمران تھا۔ جہاد اور اجتہاد کی زبردست روح ان کے اندر کارفرما تھی۔ روحانی اور مادی دونوں حیثیتوں سے وہ دنیا میں ایک غالب قوم تھے اور تمام اقوامِ عالم کی پیشوائی کا منصب ان کو حاصل تھا۔ اس وقت کوئی تہذیب ان کی تہذیب کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکی۔ انھوں نے جس طرف رُخ کیا، قوموں کے حالات، نظریات، علوم، اخلاق و عادات اور طرزِ تمدن کا مزاج اتنا طاقتور اور مضبوط تھا کہ باہر سے جو چیز بھی اس میں آئی، وہ اس کی طبیعت کے مطابق ڈھل گئی اور کسی بیرونی اثر سے اس میں سوئے مزاج مختلف پیدا نہ ہو سکا۔ بخلاف اس کے انھوں نے جو اثرات دوسروں پر ڈالے، وہ انقلاب انگیز ثابت ہوئے۔ بعض غیر مسلم تہذیبیں تو اسلام میں جذب ہو کر اپنی انفرادیت ہی کھو بیٹھیں، اور بعض جن

میں زندگی کی طاقت زیادہ تھی، وہ اسلام سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ ان کے اصول میں بہت کچھ تغیر واقع ہوگیا۔ مگر یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا''۔ (تنقیحات۔ بحوالہ ادبیاتِ مودودیؒ۔ مرتب: پروفیسر خورشید احمد۔ صفحہ ۴۰)

مولانا کا یہ اقتباس ہمیں یہ اصول سکھاتا ہے کہ اسلامی تہذیب جب توانا ہو تو دوسری تہذیبوں کے ساتھ اُمت کے معاملات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے اور اگر ہماری تہذیب عارضی اضمحلال کا شکار ہو تو پھر ہم کیا روش اختیار کریں؟

سائنس اور بالخصوص مغربی سائنس پر مسلمان جس طرح فدا ہیں، وہ سامنے کی بات ہے۔ لیکن اس علم نے مغرب میں کیا نتائج پیدا کیے اور سائنس اور فلسفۂ سائنس میں کیا فرق ہے، اس کا شعور تو ہمارے دانشوروں اور اسکالرز میں بھی عام نہیں۔ مگر دیکھیے تو مولانا ہمیں اس حوالے سے کہاں لے جاتے ہیں:

''انیسویں صدی میں مادیت اپنے کمال کو پہنچ گئی' فوگت (Vogt) بوخنر (Bochner) سولبے (Czolbe) کومت (Comte) مولشات (Moleschotte) اور دوسرے حکما و فلاسفہ نے مادہ اور اس کے خواص کے سوا ہر شے کے وجود کو باطل قرار دیا۔ مل (Mill) نے فلسفہ میں تجربیت اور اخلاق میں افادیت (Utiliterianism) کو فروغ دیا۔ اسپنسر (Spencer) نے فلسفیانہ ارتقائیت اور نظامِ کائنات کے خود بخود پیدا ہونے اور زندگی کے آپ سے آپ رونما ہو جانے کا نظریہ پوری قوت کے ساتھ پیش کیا۔ حیاتیات (Biology) فعلیات (Physiology) ارضیات (Geology) اور حیوانیات (Zoology) کے اکتشافات' عملی سائنس کی ترقی اور مادی وسائل کی کثرت نے یہ خیال پوری پختگی کے ساتھ دلوں میں راسخ کر دیا کہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آئی ہے' کسی نے اس کو پیدا نہیں کیا۔ آپ سے آپ لگے بندھے قوانین کے تحت چل رہی ہے' کوئی اس کو چلانے والا نہیں ہے۔ آپ سے آپ ترقی کے منازل طے کرتی رہی ہے' کسی فوق الطبیعت ہستی کا ہاتھ اس خود بخود حرکت کرنے والی مشین میں کام نہیں کر رہا ہے۔ بے جان مادے میں جان کسی کے امر سے نہیں پڑتی' بلکہ خود مادہ جب اپنے نظم میں ترقی کرتا ہے تو اس میں جان پڑ جاتی ہے۔ نمو

حرکتِ ارادی، احساس، شعور، فکر، سب اسی ترقی یافتہ مادہ کے خواص ہیں۔ حیوان اور انسان سب کے سب مشینیں ہیں جو طبیعی قوانین کے تحت چل رہی ہیں۔ ان مشینوں کے پرزے جس طور سے ترتیب پاتے ہیں اسی طور کے افعال ان سے صادر ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی اختیار اور کوئی آزاد ارادہ (Free will) نہیں ہے، ان کے نظام کا درہم برہم ہو جانا، ان کی انرجی کا خرچ ہو جانا ہی ان کی موت ہے جو فنائے محض کی ہم معنی ہے۔ جب مشین ٹوٹ پھوٹ گئی تو اس کے خواص بھی باطل ہو گئے۔ اب ان کے لیے حشر اور بار دگر پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

یہی وہ فلسفہ اور سائنس ہے جس نے مغربی تہذیب کو پیدا کیا ہے۔ اس میں نہ کسی علیم و قدیر خدا کے خوف کی گنجائش ہے، نہ نبوت اور وحی والہام کی ہدایت کا کوئی وزن، نہ موت کے بعد کسی دوسری زندگی کا تصور، نہ حیاتِ دنیا کے اعمال پر محاسبے کا کوئی کھٹکا، نہ انسان کی ذاتی ذمہ داری کا کوئی سوال، نہ زندگی کے حیوانی مقاصد سے بالاتر کسی مقصد اور کسی نصب العین کا کوئی امکان۔ یہ خالص مادی تہذیب ہے۔ اس کا پورا نظام خدا ترسی، راست روی، صداقت پسندی، حق جوئی، اخلاق، دیانت، امانت، نیکی، حیاء، پرہیز گاری اور پرہیز گاری کے ان تصورات سے خالی ہے جن پر اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کا نظریہ اسلام کے نظریہ کی بالکل ضد ہے۔ اس کا راستہ اس راستہ کی عین مخالف سمت میں ہے جو اسلام نے اختیار کیا ہے۔ اسلام جن چیزوں پر انسانی اخلاق اور تمدن کی بنا رکھتا ہے ان کو یہ تہذیب بیخ و بُن سے اُکھاڑ دینا چاہتی ہے اور یہ تہذیب جن بنیادوں پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی عمارت قائم کرتی ہے ان پر اسلام کی عمارت ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتی۔۔۔۔'' (تنقیحات۔ صفحات ۱۵ تا ۱۸)

آپ دیکھ رہے ہیں آج کا کالم اتنا ''مالدار'' ہو گیا کہ مولانا کی تحریروں کے ان اقتباسات کو جماعت کے ایک ایک کارکن تک نہیں، ایک ایک مسلمان تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ یہ بجائے خود ایک تہذیبی خدمت ہوگی۔ مگر اس سے قبل آئیے شاہنواز فاروقی کی آڑ میں مولانا مودودیؒ پر حملہ کریں اور ٹمبکٹو سے آنے والے میمنے کی تقریر سنیں۔ سُنا ہے وہ بھی تہذیبوں کے تصادم پر اتھارٹی ہو گیا ہے۔

تہذیبوں کا تصادم اور سید قطب شہید

اکبرالٰہ آبادی، علامہ اقبال اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی فکر میں برپا تہذیبوں کا تصادم ان کی تحریروں کے ٹھوس حوالوں کے ساتھ ثابت کیا جا چکا۔ اکبرالٰہ آبادی معروف معنوں میں کوئی عالمِ دین نہیں تھے لیکن ان کی تخلیقی فکر خاص طور پر تہذیبی فکر کا ایک ذرہ بھی ایسا نہیں جو اسلامی فکر سے ماخوذ نہ ہو۔ گمان غالب ہے کہ اکبر نے قرآن ضرور پڑھا ہوگا اور احادیث کا بھی وہ کچھ نہ کچھ علم رکھتے ہوں گے۔ اس لیے کہ ان کے زمانے میں یہ عام باتیں تھیں۔ بلکہ اکبر کا زمانہ تو ایسا تھا کہ اسلامی فکر فضا اور ہوا میں تھی، چنانچہ ناخواندہ لوگ بھی اچھا خاصہ مذہبی فہم رکھتے تھے۔ مطلب یہ کہ اکبرالٰہ آبادی نے اپنی بے مثال اور عہد آفریں شاعری میں تہذیبوں کا تصادم دکھایا ہے تو قرآن وحدیث پڑھنے کے بعد ہی دکھایا ہوگا۔

اقبال نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ عالمِ دین ہیں بلکہ وہ اپنے بے پناہ علم کے باوجود علماء سے رہنمائی حاصل کرتے رہتے تھے، لیکن اقبال کی تحریروں سے ثابت ہے کہ انھوں نے براہِ راست بھی قرآن وحدیث کا مطالعہ کیا اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد ہی انھوں نے اپنی شاعری میں تہذیبوں کا تصادم دکھایا ہے اور اسلامی تہذیب اور جدید مغربی تہذیب کی کامل عدم مطابقت ثابت کی ہے۔

مولانا مودودیؒ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ صرف دانشور اور مفکر ہی نہیں، مفسرِ قرآن بھی ہیں۔ چنانچہ ان سے بہتر کون جانتا ہوگا کہ اسلام دعوتِ حق اور شہادتِ حق کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ دوسری اقوام اور دوسری تہذیبوں سے تعلقات کے بارے میں اس کی ہدایت کیا ہے؟ مگر اس کے باوجود مولانا جدید مغربی تہذیب کو جاہلیتِ خالصہ، باطل، تخمِ خبیث اور شجرِ خبیث کہتے ہیں اور ''تنقیحات'' میں جگہ جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ اسلامی اور مغربی تہذیب کے درمیان تصادم برپا ہے تو اس کے کوئی تو معنی ہوں گے۔ پھر اہم بات یہ ہے کہ مولانا کی فکر کے یہ حوالے کسی ایک دور

سے متعلق نہیں۔ مولانا ۱۹۳۰ء کی دہائی میں بھی یہی فرمارہے تھے اور ۱۹۶۰ء کی دہائی میں بھی ان کی رائے یہی تھی۔ چنانچہ اب اگر کوئی شخص اس سلسلے میں قرآن وحدیث کے حوالے دے کر یہ کہے کہ تہذیبوں کے درمیان تصادم نہیں ہے تو اب یا تو وہ مولانا مودودیؒ، اقبال اور اکبرالٰہ آبادی سے زیادہ اسلام اور اس کے منشا کو سمجھتا ہے یا پھر وہ ان شخصیات کے حاسدوں کے کسی ٹولے کا رکن اور سنگین نفسیاتی امراض میں مبتلا کوئی شخص ہے۔ جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے تو ہمیں پاکستان کیا، پورے عالمِ اسلام میں بھی مولانا مودودیؒ، اقبال اور اکبرالٰہ آبادی سے بڑا آدمی نظر نہیں آتا۔ خیر دنیا کا کیا ہے، اس میں تو خدا کا انکار کرنے والے بھی ہیں اور ایسے لوگ بھی جن کے سر پر سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا ہوتا ہے اور وہ کہتے ہیں سورج کی موجودگی ثابت کرو۔ کسی زمانے میں احتیاطاً ایسے لوگوں کو پاگل خانے بھیج دیا جاتا تھا۔ مگر آج کل تو ایسے لوگ ہر شہر میں کھلے پھرتے ہیں۔ بہرحال کوئی شخص مولانا مودودیؒ، اقبال اور اکبرالٰہ آبادی سے حسد کرے اور ان کی فکر سے ثابت شدہ مسلمات کا انکار کرے تو اسے صرف یہی مشورہ دیا جاسکتا ہے، محنت کر حسد نہ کر۔

بات تہذیبوں کے تصادم کی ہو اور اس میں مولانا مودودیؒ کا ذکرِ خیر آئے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم سید قطب شہید تک نہ جائیں۔ معاصر اسلامی دنیا پر مولانا مودودی کے علاوہ جس شخصیت کا سب سے گہرا اثر ہے، وہ سید قطب شہید ہیں۔ سید قطب بھی صرف دانشور اور مفکر نہیں تھے، انھوں نے فی ظلال القرآن کے عنوان کے تحت قرآنِ پاک کی تفسیر بھی لکھی ہے۔ زیرِ بحث موضوع کے حوالے سے اہم ترین بات یہ ہے کہ مغربی تہذیب سید قطب کی فکر کا بھی مرکزی حوالہ ہے۔ چنانچہ پورے عالمِ اسلام کو یقیناً اس بات سے دلچسپی ہونی چاہیے کہ تہذیبوں کے تصادم کے بارے میں سید قطب شہید مغربی تہذیب کو تہذیب تسلیم کرتے ہیں؟ نیز تہذیبوں کے تصادم کے منکرین کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے؟ ان دونوں سوالات کا جواب سید قطب شہید کے الفاظ میں سنیے:

''اس مرحلے پر چند مغرب پرست جن کی نگاہیں تہذیبِ نو کی روشنی سے خیرہ ہوچکی ہیں، یہ

کہیں گے کہ کسی فرد کے سماج کی روایات کو توڑ دینے میں کوئی تصادم اور انتشار نہیں ہے بلکہ ہم اہلِ مشرق اس لیے اس کو انتشار سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی فرسودہ روایات کے غلام بنے ہوئے ہیں جو دورِ جدید سے ہم آہنگ نہیں ہیں''۔ (اسلام اور جدید مادی افکار۔ صفحہ ۲۲۱۔ چوتھا ایڈیشن)

یہ تو بسم اللہ ہوئی، مگر اس بسم اللہ سے معلوم ہوا کہ تہذیبوں کا تصادم صرف انہی کو نظر نہیں آتا جن کی نگاہیں مغربی تہذیب نے خیرہ کردی ہیں۔ دوسری اہم بات اس بسم اللہ میں یہ ہے کہ سید قطب نے اپنے بیان میں اسلام کے بجائے مشرق کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یعنی وہ صرف عالم اسلام ہی کو نہیں، پورے مشرق کو مغرب کے مقابل لے آتے ہیں۔ چلتے چلتے اس سلسلے میں سید قطب کا ایک اور بیان پڑھ لیجیے:

''مغرب تمام اَقدارِ عالیہ کا انکار کرتا ہے اور صرف مادی مفادات پر یقین رکھتا ہے۔۔۔ دراصل مغرب نے ساری توجہ اس تہذیب پر صرف کی ہے جو خالص مادہ پرستانہ تہذیب ہے اور اسی میں مگن ہے''۔ (اسلام اور جدید مادی افکار۔ صفحہ ۴۴۷ اور ۴۵۱۔ چوتھا ایڈیشن)

سید قطب شہید کے ان بیانات سے تین چیزیں ثابت ہوئیں۔ سید قطب بھی سید مودودی، اقبال اور اکبر الٰہ آبادی کی طرح مغرب کو باطل سمجھنے کے باوجود اس کے لیے تہذیب ہی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں جو بلاشبہ عربی کی متعلقہ اصطلاح کا ترجمہ ہے لیکن ایسا ترجمہ جس کے لیے تہذیب کے سوا کوئی لفظ کفایت نہیں کرتا۔ دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ مغرب تمام اقدارِ عالیہ کا انکار کرتا ہے، اس لیے اسلامی اور مغربی تہذیب کا تصادم جزوی نہیں کلی ہے۔ حیرت ہے سید قطب نے ایسی باتیں کہتے ہوئے فوکویاما یا ہن ٹنگٹن کو کوٹ نہیں کیا۔ مگر سید قطب یہ کام کیسے کرتے؟ سید قطب نے یہ بات ۱۹۷۰ء کی دہائی میں کہی اور یہ دونوں مغربی دانشور ۱۹۹۰ء کی دہائی میں اپنا تصادم لے کر طلوع ہوئے۔ خیر یہ تو سرسری باتیں تھیں۔

ہم نے تہذیبوں کے موازنے کے جو چار پیمانے ''ایجاد'' کیے ہیں، آئیے انھیں پھر دوہرالیں۔

۱۔ الٰہیات یعنی Ontology　　　۲۔ علمیات یعنی Epistimology

۳۔ تصورِ تخلیق یعنی Efficient Cause ۴۔ Final Cause

یہ چاروں پیمانے ہم اکبرالہ آبادی، اقبال اور مولانا مودودی کی تحریروں سے نکال کر دکھا چکے۔ بعض لوگ بد دیانتی اور حد درجے کی بد تہذیبی کرتے ہوئے بڑے لوگوں کے منہ میں اپنی زبان ڈالتے ہیں مگر ہم نے جو بات کہی ہے، اس کا حوالہ بھی دیا ہے۔ یہی نسخہ سید قطب کے سلسلے میں بروئے کار لایا جارہا ہے۔ اس لیے کہ علمی اور فکری طریقہ کار یہی ہے تو سب سے پہلے الٰہیات۔

الٰہیات کے معنی یہ ہیں کہ کوئی تہذیب اللہ کا کیا تصور رکھتی ہے۔ وہ وجودِ خدا کی قائل ہے یا کسی اور چیز کو اس نے خدا کا درجہ دے دیا ہے۔ سید قطب کے بارے میں یہ کہنا فضول ہے کہ وہ توحید کے ماننے والے تھے مگر مغرب کی الٰہیات Ontology کے بارے میں ان کی رائے کیا تھی، فرماتے ہیں:

''اشتراکیت تین بنیادوں پر ڈارون کے افکار سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ ایک یہ کہ طبیعت (Nature) کو خدا کا مقام دے دینا اور خدا کے وجود کو نہ ماننا۔۔۔ یہ بعینہٖ وہی مادہ پرستانہ نقطۂ نظر ہے جس کا یورپ قائل ہے۔ اور اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ اشتراکیت کوئی نئی شے نہیں ہے بلکہ مغربی مادی تہذیب ہی کا پرتو ہے''۔ (اسلام اور جدید مادی افکار۔ صفحات ۱۰۸ اور ۱۰۹۔ چوتھا ایڈیشن)

افسوس ہے کہ اکبرالہ آبادی، اقبال اور مولانا مودودی کے بعد سید قطب نے بھی تہذیبوں کو اساسی طور پر Define کرنے والے ہمارے پہلے پیمانے کی گواہی دے دی ہے اور ثابت ہو گیا کہ اسلامی تہذیب اور جدید مغربی تہذیب کی الٰہیات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مگر باقی تین پیمانوں کا کیا ہوگا؟ کیا سید قطب شہید اس کے سلسلے میں بھی ہماری تائید فرمادیں گے؟ اس کا اندازہ تو کل ہی ہو سکے گا۔ مگر آیئے کل تک اکبرالہ آبادی، اقبال اور مولانا مودودی کی صف میں سید قطب کو بٹھا کر ان سے حسد کریں اور ان کی علمی کاوشوں کا جواب ''قے'' سے دیں۔ (جاری ہے)

تہذیبوں کا تصادم اور سید قطب شہید (۲)

الٰہیات کے بعد تہذیبوں کی تعریف متعین کرنے والا یا انھیں Define کرنے والا دوسرا اصول کسی بھی تہذیب کا تصورِ علم یا اس کی Epistimology ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر تہذیب کے دائرے کا ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ حتمی علم کا سرچشمہ کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ یہ سوال ان معنوں میں الٰہیات سے بھی زیادہ اہم ہے کہ الٰہیات کا تعین بھی تصورِ علم ہی سے ہوتا ہے۔ جیسی جس تہذیب کی Epistimology ہوتی ہے، ایسی ہی اس کی الٰہیات یا Ontology ہوتی ہے اور ہم عرض کر چکے ہیں کہ اسلامی تہذیب کا تصورِ علم ''وحی'' ہے اور مغربی تہذیب کا سائنس۔ اکبرالٰہ آبادی، اقبال اور مولانا مودودیؒ نے بھی یہی فرمایا ہے۔ آیئے اب دیکھتے ہیں کہ سید قطب شہید کیا فرماتے ہیں:

''حقیقت کے ادراک کا ایک ہی منبع ہے جو رسالتوں کا منبع ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے گمراہی اور باطل ہے''۔ (قرآن و سائنس۔ صفحہ ۵۰۔ اشاعت اول)

مگر یہ تو اسلامی تہذیب کی علمی پوزیشن ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں رسالت کا لفظ وحی کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے لیکن سید قطب کے نزدیک جدید مغربی تہذیب کی Epistimology کیا ہے؟ سید قطب شہید کہتے ہیں:

''تجربہ دورِ جدید کی ایک ایسی امتیازی علامت ہے جس نے مغربی عقلیت پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔۔۔ تجربی سائنس کے نتائج اس قدر اہمیت کے حامل ثابت ہوئے کہ۔۔۔ اہلِ مغرب تجربی سائنس پر سچا ایمان لے آئے۔۔۔ چونکہ تجربی سائنس کا دائرہ محصولات ہی ہو سکتے تھے، اس لیے اہلِ مغرب نے ان باتوں پر ایمان برقرار رکھا جو محسوسات کے دائرے میں آئی تھیں اور جو باتیں اس دائرے میں نہ آئی تھیں، وہ یکلخت ان کے ایمان و یقین سے خارج ہو گئیں۔۔۔ اور انھوں نے اس راستے کے سوا معرفت کا ہر راستہ بند کر دیا۔۔۔

چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ بھی نعوذ باللہ کسی تجربہ گاہ میں نہیں لے جائی جاسکتی تھی، اس لیے اہلِ مغرب کو خدا کی بھی ضرورت نہ رہی اور انھوں نے برملا کہہ دیا کہ کوئی خدا نہیں ہے''۔ (اسلام اور جدید مادی افکار۔ صفحات ۹۳، ۹۴ اور ۹۵۔ چوتھی اشاعت)

سید قطب کی بنیادی دلچسپی جن چیزوں میں تھی، ان میں ''تصورِ علم'' یا Epistimology سرفہرست ہے اور انھوں نے اسلام اور جدید مادی افکار اور قرآن و سائنس میں اس موضوع کی جزیات پر بھی بحث کی ہے، مطلب یہ کہ یہاں مثالوں کا ڈھیر لگایا جاسکتا ہے لیکن اس کی ضرورت نہیں۔ اب ہم تہذیبوں کے تیسرے اساسی تصور یا پیمانے کی طرف چلتے ہیں۔

تصورِ تخلیق یا Efficient Cause اس سلسلے کا تیسرا پیمانہ ہے اور ہم عرض کر چکے ہیں کہ جب اس شور کے حوالے سے ہم اسلامی اور جدید مغربی تہذیب کا موازنہ کرتے ہیں تو اسلامی تہذیب کا یہ تصور ہمارے سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کُن کہا اور یہ پوری کائنات وجود میں آ گئی، اس کے مقابلے پر جدید مغربی تہذیب ڈارون کا تصورِ ارتقاء لے کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ سید قطب شہید اس باب میں کیا فرماتے ہیں:

''یہ کہنا کہ انسان اور خالقِ انسان میں کوئی رشتہ و تعلق نہیں بلکہ طبیعت (Nature) خود ہی زندگی کی رکھوالی کرتی ہے اور طبیعت ہی زندگی کو ارتقائی مراحل سے گزار کر تخلیق انسان تک لے آئی ہے، ایک مضحکہ خیز نظریہ ہے اور جس پر صرف اہلِ مغرب ہی یقین کر سکتے ہیں۔۔۔ (البتہ) مغربی تاریخ بتاتی ہے کہ ڈارون کا فلسفہ ارتقاء علوم و فنون کی تاریخ میں ایک ایسا نقطۂ انقلاب ہے جس نے سوچ کے دھارے بدل کر رکھ دیے اور اس کے بعد آنے والے تمام سائنس دانوں کی فکر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی''۔ (اسلام اور جدید مادی افکار۔ صفحات ۴۷ اور ۴۹۔ چوتھی اشاعت)

اس کے مقابلے پر اسلامی تہذیب جس تصورِ تخلیق کو ہمارے سامنے لاتی ہے، اس کا ذکر بھی سید قطب شہید کی زبانی سنیے، لکھتے ہیں:

''ہر چیز کو اس کی تخلیق کے وقت اس کے رب کی جانب سے رہنمائی فراہم کر دی گئی۔ یہی آدم کے ساتھ بھی ہوا۔ اس کی تخلیق کے وقت ہی اسے اس کی صورت اور انسانی خصوصیات دی

گئیں ۔۔۔نشو وارتقاء کے نظریے کا زمین کی کھدائی سے برآمد ہونے والی چیزوں کے بھروسے پر یہ کہنا کہ حیوانات ہی ایک دوسرے سے ترقی یافتہ مراحل میں رہے ہیں جن کے درمیان زمانی ترتیب پائی گئی، محض ایک ظنی نظریہ ہے۔ یقینی امر نہیں''۔ (قرآن وسائنس۔ صفحات ۸۰ اور ۸۱۔ اشاعتِ اول)

تہذیب کو Define کرنے والا چوتھا تصور حتمی قدر یا Final Cause کا تصور ہے اور اسلامی تہذیب یہاں ہمارے سامنے تجارت کا تصور رکھتی ہے اور جدید مغربی تہذیب ''ترقی'' کا۔ سید قطب شہید کے یہاں ''نجات'' کے تصور کو ثابت کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ البتہ یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ جدید مغربی تہذیب کے تصورِ ترقی کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس سلسلے میں کسی تہذیب کے مادی معیار کو فیصلہ کن مقام نہیں ملنا چاہیے، اس لیے کہ مادی تہذیب کی روز افزوں ترقی کا دار و مدار ان وسائل پر ہے جنہیں ترقی پذیر سائنس مسلسل ایجاد کرتی رہتی ہے''۔ (قرآن وسائنس۔ صفحہ ۷۷۔ اشاعتِ اول)

ہمیں افسوس ہے کہ تہذیبوں کے تصادم کا جو تصور اکبر الہ آبادی، اقبال اور مولانا مودودیؒ کی فکر سے ثابت ہو چکا ہے، وہی تصور سید قطب شہید کی تحریریں بھی ثابت کر رہی ہیں۔ حیرت ہے کہ سید قطب شہید نے بھی تہذیبوں کی عدم مطابقت ثابت کرتے ہوئے فوکو یاما اور ہن ٹنگٹن سے اجازت نامہ لینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس امر کی تحقیق کی جا سکتی ہے کہ کہیں ان شخصیات نے ایک دوسرے کی ''نقل'' تو نہیں کی؟ آخر یہ سلسلہ کیا ہے؟

ہمارا خیال تھا کہ ہم مولانا مودودیؒ کے بعد ادب اور آرٹ کی سیر کریں گے۔ عسکری صاحب اور سلیم احمد کے علاوہ کچھ ''انگریزی مصنفین'' کا ذکرِ خیر رہے گا مگر اب ہم سید قطب کے بعد دار العلوم دیو بند کے سابق مہتمم قاری طیبؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کی عقلیات کو آسان کر سکے تو ان کی جانب جائیں گے۔ مولانا ایوب دہلویؒ بھی منصوبے میں شامل ہیں۔ دائرہ ہی بنانا ہے تو بڑا دائرہ کیوں نہ بنایا جائے؟ یہ گفتگو تو ابھی ان شاء اللہ دو تین سال چلے گی۔

تہذیبوں کا تصادم اور ہمارے دانشور

بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹتا ہی رہتا ہے۔ چنانچہ ہمارے بعض دانشوروں کو الہام ہوا ہے کہ تہذیبوں کے درمیان تصادم کی بات ہی غلط ہے۔ ان کے بقول تہذیبوں کے درمیان تو تصادم ہوتا ہی نہیں۔ لڑتی ہے تو بدتہذیبی سے بدتہذیبی لڑتی ہے۔ اس لیے کہ جہاں تہذیب ہوتی ہے، وہاں علم اور شعور ہوتا ہے، وہاں لڑائی جھگڑا تھوڑی ہوتا ہے، وہاں تو امن کی فاختائیں اُڑتی ہیں، محبت کے گیت گائے جاتے ہیں، تعاون کی گھٹائیں برستی ہیں۔ کہنے کو یہ خیالات ''علمی'' کہلاتے ہیں، مگر دراصل انھیں ''فلمی'' کہنا بھی مشکل ہے۔ اس لیے کہ فلم میں ڈرامہ ہوتا ہے اور ڈرامہ خیر وشر کی آویزش پر کھڑا ہے۔ جہاں خیر وشر کی آویزش نہیں ہے، وہاں تقدیر اور تدبیر کی کشمکش ہے۔

خیر وشر اپنی نہاد میں مذہبی اصطلاحیں ہیں اور مذہبی تناظر میں ان کا تصادم ازلی و ابدی ہے۔ جب سے یہ دنیا بنی ہے، ان کے مابین آویزش جاری ہے اور جب تک یہ دنیا رہے گی، ان کے مابین کشمکش برپا رہے گی۔ اس اعتبار سے یہ تصادم دو تہذیبوں کے مابین بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے اور دو گروہوں یا افراد کے مابین بھی۔ یہاں تک کہ یہ کشمکش تو ہر انسان میں برپا رہتی ہے۔ بعض لوگ کربلا سے ڈرتے ہیں، لیکن کربلا تو انسان کے اندر بھی برپا رہتی ہے۔ اقبال نے کہا ہے:

مرا دل مری رزم گاہِ حیات
گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات

سلیم احمد کا ایک شعر ہے:

وہ رن مجھ میں پڑا ہے خیر و شر کا
کہ اپنی ذات میں اِک کربلا ہوں

اس بنیاد پر انسانی تاریخ میں تہذیبیں، تہذیبوں کے مقابل آتی رہی ہیں۔ مقابل آنے

سے موازنے، مطابقت اور عدم مطابقت کے معاملات سامنے آتے ہیں اور ایک آویزش ازخود شروع ہوجاتی ہے۔

جس طرح افراد اپنے تصورِ حسن و قبح پر اصرار کرتے ہیں، اسی طرح تہذیبیں بھی اپنے تصورِ خیر و شر پر اصرار کرتی ہیں اور اس اصرار سے کسی نہ کسی مرحلے پر تصادم ضرور پیدا ہوتا ہے۔ تاریخ اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ اس میں ایسی حیرت اور اعتراض کی بات کیا ہے؟

البتہ اتنا ضرور ہے کہ اصرار اصرار میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً اس وقت جدید مغربی تہذیب اپنے عقائد و نظریات اور ان کی برتری پر اصرار کر رہی ہے اور اسلامی تہذیب کے علمبردار اپنی تہذیب کے عقائد و اَقدار پر اصرار کر رہے ہیں۔ لیکن مغربی تہذیب کا اصرار ایک مفاداتی اور موضوعی اصرار ہے اور اسلامی تہذیب کا اصرار ایک غیر شخصی اور معروضی اصرار ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ کیا بات ہوئی؟ اہلِ مغرب بھی اپنے بارے میں یہی سمجھتے ہیں۔ تو پھر یہ فیصلہ کیسے ہو کہ درست کون ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس ایک بہت بڑی آفاقی، تاریخی اور اخلاقی منطق ہے اور اس کا تعلق دین کی روایت سے ہے۔ جو لوگ انبیاء اور مرسلین اور وحی کے قائل ہیں، انھیں ماننا پڑتا ہے کہ انبیاء اور وحی کا سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع ہوا اور مختلف انبیاء اور ان کی شریعتوں سے ہوتا ہوا بالآخر ختم ہوگیا۔ اس حوالے سے مسلمانوں کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ ہی کو نہیں، ان سے پہلے کے تمام انبیاء پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور ان کا ایمان ہے کہ حضور اکرم ﷺ پر آ کر نبوت ختم ہوگئی اور اب اسلام رہتی دنیا تک کے لیے اللہ تعالیٰ کا آخری اور واحد قابلِ عمل پیغام ہے۔ یہ ایک ایسا موقف ہے جس میں تاریخی، اخلاقی اور منطقی اعتبار سے کوئی جھول نہیں۔ اسی لیے مسلمانوں کا اپنی تہذیب پر اصرار غیر شخصی اور معروضی ہے۔ لیکن یہودیوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کو تو پیغمبر مانتے ہیں، مگر حضرت عیسیٰ کو پیغمبر تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ انبیاء کی روایت میں یہ تصور موجود ہے کہ آخری نبی تک نبوت کا سلسلہ چلے گا اور حضرت موسیٰ نے کہیں نہیں فرمایا کہ میں آخری نبی ہوں۔ چنانچہ

یہودیوں کا حضرت عیسیٰ اور بعد ازاں رسول اللہ ﷺ کو تسلیم نہ کرنا تاریخی، اخلاقی اور منطقی اعتبار سے بلا جواز ہے۔ یہی مسئلہ عیسائیوں کا ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کو نبی مانتے ہیں مگر رسول اللہ ﷺ کو آخری رسول تسلیم نہیں کرتے، بلکہ رسول ہی نہیں مانتے، حالانکہ حضرت عیسیٰ نے کہیں نہیں فرمایا کہ میں آخری نبی ہوں۔ چنانچہ عیسائیوں کا دعویٰ بھی تاریخی، منطقی اور اخلاقی اعتبار سے انتہائی کمزور ہے اور اپنی تہذیب پر ان کا اصرار مفاداتی اور موضوعی ہے۔ (باقی کل)

تہذیبوں کا تصادم اور ہمارے دانشور (۲)

اگر مغرب کے بارے میں یہ تسلیم کیا جائے کہ وہ سیکولر ہے تو سیکولر نظریات میں وحی اور اس کی بالادستی کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں۔ یہی معاملہ وحی کی بنیاد پر وجود میں آنے والی اسلامی تہذیب کا ہے۔ اس کے دائرے میں ''عقل'' کو حتمی اور واحد اتھارٹی تسلیم ہی نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ان کے درمیان مطابقت اور ہم آہنگی کی کوئی صورت ممکن نہیں۔

اب یہاں ایک اور صورت سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ دونوں تہذیبیں اپنے اپنے اصولوں پر بے شک اصرار کریں، لیکن انھیں دوسرے پر نہ تھوپیں، تو مسلمان چاہیں بھی تو اپنی اَقدار مغرب پر نہیں تھوپ سکتے۔ ان کا سکہ مغرب میں چل رہا ہے نہ مغرب پر ان کا بس ہی چلتا ہے۔ البتہ مغرب مسلمانوں پر اپنی ہر چیز مسلط کیے ہوئے ہے۔ تو اب مسلمان کیا کریں؟ انسانی عقل کو خدا ماننے والی تہذیب کی ہر شے کو قبول کرلیں؟ وہ ایسا کرتے ہیں تو اپنی تہذیبی بنیادیں کھودتے ہیں۔ اگر وہ مغرب کے تہذیبی ایجنڈے کو نہیں مانتے تو تصادم ناگزیر ہے۔ ہم گزشتہ دوسو سال میں بڑی حد تک اپنی تہذیبی بنیادیں کھود چکے ہیں، مگر مغرب اس کھدائی پر مطمئن نہیں۔ وہ کہہ رہا ہے کہ کھدائی اور گہرائی میں جا کر کرنی ہوگی۔ اب یہاں جو کلیات فرض کیے جاسکتے ہیں، وہ یہ ہیں: ایک یہ کہ دونوں طرف تہذیبیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ دونوں طرف بدتہذیبی ہے، تیسرے یہ کہ ایک طرف تہذیب ہے اور دوسری طرف بدتہذیبی۔ مسئلہ یہ ہے کہ آپ ان میں سے خواہ کسی کلیے کو درست مان لیں، تصادم سے بہر حال نہیں بچا جاسکتا کیونکہ فرق و امتیاز اور عدم مطابقت ہر صورت میں باقی رہتی ہے۔

کہنے والے کہتے ہیں ہمیں مکالمہ کرنا چاہیے۔ لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ بدتہذیبی کا تصادم ہے، انھیں تو مکالمے کی اصطلاح بھی زبان پر نہیں لانی چاہیے۔ اس لیے کہ بدتہذیبوں کے درمیان تو مکالمہ ممکن ہی نہیں۔ اگر ہم دونوں کو تہذیبیں تسلیم کرتے ہیں تو مسئلہ یہ ہے کہ یہ دو

مختلف تہذیبیں ہیں اور دو مختلف تہذیبوں کے درمیان مکالمے کی بنیاد تلاش کرنا بھی دشوار ہے، خاص طور پر اس صورت میں جب ایک تہذیب کے پاس بے پناہ طاقت بھی ہے۔ اگر ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایک طرف تہذیب اور دوسری طرف بدتہذیبی ہے تو بھی دونوں کے مابین مکالمہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ خیال آگے بڑھایا جاتا ہے تو ہم مشترکات پر جمع ہو جاتے ہیں لیکن ہم یہ نہیں دیکھتے کہ مشترکات میں ترغیب وتحریص نہ ہونے کے برابر ہے، البتہ غیر مشترکات تحریص و ترغیب سے بھرے پڑے ہیں۔ خاص طور پر مغرب کے حوالے سے تو یہی معاملہ ہے۔ آخر مغربی دنیا مسلمانوں کے ساتھ مشترکات پر جمع ہو کر کیا حاصل کرسکتی ہے۔ یہ اتنی سامنے کی بات ہے مگر اچھے اچھوں کو نظر ہی نہیں آتی۔

خدا جانے ہمارے یہاں تہذیب کا یہ مفہوم کہاں سے اخذ کرلیا گیا کہ مہذب لوگ کبھی نہیں لڑتے۔ ارے بھائی! مہذب آدمی اس کو نہیں کہتے جو کبھی نہیں لڑتا۔ مہذب آدمی وہ ہوتا ہے جو کبھی غلط بات پر نہیں لڑتا۔ بھلا مولانا رومؒ سے زیادہ مہذب، صاحبِ علم اور صاحبِ شعور کون ہو گا؟ وہ شاعر تھے، صوفی تھے، درویش تھے، لیکن اس کے باوجود تہذیبوں کی پوزیشن واضح کرتے ہوئے انھوں نے ہی کہا ہے:

مصلحت در دینِ عیسیٰؑ غار و کوہ
مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ

لیجیے مولانا روم نے اُمتِ مسلمہ کے لیے جنگ کے ساتھ ساتھ ''شکوہ'' کا چکر بھی لگا دیا۔ بلاشبہ مولانا رومؒ نے اچھا نہیں کیا، مگر مولانا روم اسامہ بن لادن تو ہیں نہیں کہ انھیں دہشت گرد قرار دے دیا جائے اور کہا جائے کہ لیجیے یہ تو مسلمانوں کو سکھا رہے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے دین کی مصلحت بے شک ترکِ دنیا ہے، لیکن دینِ محمدی کی مصلحت جنگ اور شان وشوکت ہے۔ تو جس چیز سے مولانا روم کو شرم نہیں آتی، اس سے ہمارے بعض دانشوروں کو کیوں حیا آتی ہے؟

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ بعض لوگوں کو پُرامن کہلوانے کا شوق ہے اور یہ ان کا ذاتی مسئلہ

ہے جسے وہ خواہ مخواہ اسلام پر مسلط کر دیتے ہیں۔ اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ بعض لوگوں کو اس کا یقین ہی نہیں کہ تصادم ہوا تو اس میں فتح مسلمانوں کی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا تیسرا جواب یہ ہے کہ کچھ لوگ فتح و شکست سے آگے سوچ ہی نہیں سکتے۔

تہذیبوں کا تصادم اور ریڈیکل اسلام

تکبر کا معاملہ بھی عشق اور مشک کی طرح ہے۔ جس طرح عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے، اسی طرح تکبر بھی پردے کے پیچھے نہیں رہتا اور پھر مغرب کے تکبر کی تو بات ہی اور ہے، وہ صدیوں سے کفن پھاڑ کر بول رہا ہے۔ اس کا مسلمانوں کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہو رہا ہے کہ بے چارے مسلمان جو بات خود سوچ سمجھ کر نہیں سمجھ پاتے، مغرب کا تکبر مسلمانوں کو وہ بات سمجھا دیتا ہے۔ مغرب کا تکبر اتنا سنگین نہ ہوتا تو شاید کروڑوں مسلمان تہذیبوں کے تصادم کی حقیقت سے ناواقف ہی رہ جاتے مگر اب تو جناب ارشاد احمد حقانی نے بھی ۱۴ فروری کے کالم میں تسلیم کر لیا ہے کہ تہذیبوں کا تصادم ایک حقیقت بن کر ابھر چکا ہے۔

اس سلسلے میں انھوں نے جارج بش کے حالیہ اسٹیٹس آف دی یونین خطاب کی مثال بھی دی ہے جس میں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اہم ترین بات جارج بش نے یہ کہی ہے کہ Radical Islam کا قلع قمع امریکا کی اولین ترجیحات میں شامل ہے۔ کروسیڈ کے لفظ کی طرح یہ اصطلاح بھی تہذیبوں کے تصادم کی نفسیات کا عکس ہے اور مسلمانوں کو اس کے معانی سمجھنے چاہییں۔

مغربی دنیا نے حالیہ دہائیوں میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے مختلف اصطلاحیں وضع کی ہیں، مثلاً سیاسی اسلام، ملائیت، سلفیت یا سلفی اسلام، ریڈیکل اسلام یا انتہا پسند اسلام۔ اس سے اہلِ مغرب کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ تمام عنوانات حقیقی اسلام کے لیے خود اجنبی ہیں چنانچہ وہ تمام لوگ جو کسی نہ کسی عنوان سے ان ناموں کے دائرے میں آتے ہیں، مسلم معاشروں میں ایک خارجی حیثیت ہیں۔

ان عنوانات کو مسلمانوں پر مسلط کرنے کا جو ایک ذیلی اور اضافی فائدہ اہلِ مغرب کو ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس طرح مسلم معاشرے دو نیم یا منقسم ہو کر باہم دست و گریباں ہو جاتے ہیں

اور ان کی اجتماعی قوت کا ایک بڑا حصہ خود بخود زائل ہو جاتا ہے۔

اہلِ مغرب اس سے قبل یہی کام جدیدیت اور قدامت کی اصطلاحیں استعمال کر کے کر چکے ہیں اور ہم آج بھی اس تقسیم میں الجھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ جدید و قدیم کی اصطلاحیں صرف جدید مغربی تہذیب کے دائرے میں معانی کی حامل ہیں اور ان کا اسلام اور اس کی فکری روایت فی نفسِہٖ کوئی تعلق نہیں۔ شاید اقبال نے انہی معنوں میں یہ بات کہی تھی کہ جب حیات و کائنات ایک ہیں تو پھر جدید و قدیم کا مسئلہ دلیلِ کم نظری کے سوا کچھ نہیں۔ بہر حال ہم اصل موضوع کی طرف چلتے ہیں۔

اسلام کی فکری کائنات میں Political اور Radical Islam کی اصطلاحیں بھی اسی طرح اجنبی ہیں جس طرح جدیدیت اور قدامت کی اصطلاحیں اپنی نہاد میں بے معنی تھیں اور ان کے استعمال کے مقاصد وہی ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا لیکن ان کے حوالے سے اہلِ مغرب کا ایک تاریخی اور نفسیاتی مسئلہ بھی سامنے آتا ہے۔

تصوف کی اصطلاحیں استعمال کی جائیں تو عیسائیت سرتاپا طریقت ہے، شریعت اس میں ہے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ایک مرحلے پر عیسائیت اور رومن قانون کا امتزاج سامنے آیا۔ سلطنتِ روم کے پاس طریقت نہیں تھی اور عیسائیت کے پاس قوانین نہیں تھے۔ اس وجہ سے عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید یعنی Old Testament اور New Testament باہم مربوط ہوئے اور یہیں سے جوڈو کرسچین تہذیب کی اصطلاح وضع ہوئی۔

اب عیسائیت کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اسلام کو بھی اپنے تجربے کی روشنی میں دیکھتی ہے اور نہیں سمجھتی کہ اسلام شریعت اور طریقت کا جامع ہے۔ اسے قانون کے لیے "باہر سے" مدد لینے کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں چرچ اور ریاست کی علیحدگی کا کبھی کوئی تصور موجود نہیں رہا اور نہ ہی یہ تصور کبھی مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مسلم معاشرت میں سیاسی اسلام، ریڈیکل اسلام اور بنیاد پرست اسلام جیسی اصطلاحوں سے صرف وہ لوگ اثر قبول کر سکتے ہیں جنہیں نہ اسلام کا کوئی علم ہے اور نہ ہی انھیں عیسائیت اور اس کی تاریخ کی کوئی خبر ہے۔

ریڈیکل اسلام کی اصطلاح کا ایک اور مفہوم بھی مغربی عزائم اور فکر کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ بہت سے مسلمان سمجھتے ہیں کہ مغرب کا مسئلہ اسلام، اس کے عقائد، عبادات یا اخلاقیات ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ مسلمان ایک خدا کو مانتے ہیں، مانیں، مغرب کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔ مسلمان رسالت اور وحی کے قائل ہیں، ہوں، مغرب کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ مسلمان آخرت کے قائل ہیں، رہیں، مغرب کو اس سے کوئی تکلیف نہیں۔ مسلمان نماز پڑھتے ہیں، پڑھیں، مغرب کو اس سے کوئی شکایت نہیں۔ مسلمان روزہ رکھتے ہیں، حج کرتے ہیں، کریں، مغرب کو اس سے کیا لینا دینا۔ مغرب کو تکلیف یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ مسلمان یہ کیوں کہتے ہیں اور یہ کیوں چاہتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور ہم زندگی کے ایک ایک شعبے پر اس کا اطلاق کریں گے۔ یہاں سے مغرب کی تکلیف اس لیے شروع ہوتی ہے کہ اسلام کا تصورِ ریاست وسیاست اس کے نام نہاد انسان مرکز جمہوری نظام کے پرخچے اڑا دیتا ہے، اور ایسا ہو جانے سے معاشرے کا نظامِ مراتب بدل کر رہ جاتا ہے۔ اسلام کے تصورِ معیشت سے مغرب کے معاشی ماڈل کی بنیادیں ہل کر رہ جاتی ہیں اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام دنیا پر اپنی گرفت کے ساتھ تحلیل ہو جاتا ہے۔ اسلام کے تصورِ معیشت سے مغرب کے معاشی ماڈل کی بنیادیں ہل کر رہ جاتی ہیں جنہیں مغرب نے صدیوں میں پروان چڑھایا ہے۔ اس سے خود تہذیب وثقافت کی بنیاد تبدیل ہو جاتی ہے اور شعروادب سمیت پوری تخلیقی زندگی مغرب کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ ان امور کا شعور مسلمانوں کو نہیں ہوگا مگر مغرب کو ہے۔ جس کی متاع داؤ پر لگی ہوئی ہے اس کو مقابل کی قوت اور اس کی فتح کے مضمرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ریڈیکل اسلام مغرب کے لیے ایک مجسم تہذیبی قوت ہے۔ اسی لیے تہذیبی تصادم کی اصطلاح اہم ہے۔

اسلامی تہذیب اور اہلِ مغرب کا احساسِ کمتری

تعلق کی بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں معکوس کیے بغیر سمجھنا دشوار ہوتا ہے۔ لیکن آپ جیسے ہی تعلق کی نوعیت کو الٹتے ہیں، ایک نیا جہانِ معنی آپ کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام، اسلامی تہذیب اور اُمتِ مسلمہ سے اہلِ مغرب کا تعلق صرف دشمنی، نفرت اور حقارت کا ہے۔ لیکن یہ پوری بات نہیں ہے۔ پوری بات یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی تہذیب کے حوالے سے اہلِ مغرب ایک بہت بڑے احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں، اس احساسِ کمتری میں جو احساسِ برتری کی زبان بولتا ہے۔ یہ اسلامی اور مغربی تہذیب کے تعلق کی معکوس صورت ہے۔ اس لیے کہ معروف Myth تو یہی ہے کہ صرف مسلمان ہی مغرب کے حوالے سے احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ لیکن مسلمانوں کا احساسِ کمتری اتنا واضح ہے کہ اس کی نشاندہی کی بھی ضرورت نہیں۔ تاہم اہلِ مغرب کا احساسِ کمتری تجزیے کا محتاج ہے۔ مگر اسے حتمی طور پر ثابت کیا جا سکتا ہے اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اہلِ مغرب بالخصوص ان کے پالیسی ساز اور خاص طور پر امریکا کے نوقدامت پسند اسلام اور اسلامی تہذیب کو کبھی رشک سے دیکھتے ہیں اور کبھی حسد سے۔

ہماری اب تک کی گفتگو سے اگر کسی کو صدمہ ہوا ہو یا اسے ہنسی آ گئی ہو تو ہم معذرت چاہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ہمیں اپنے مقدمے پر اصرار ہے۔ جدید مغربی تہذیب کی گزشتہ ۱۰۰ سال کی تاریخ میں ایک دو نہیں، درجنوں ایسے مفکرین، فلسفی اور مورخین ہوئے ہیں جنہوں نے مغربی تہذیب کے ہمہ گیر زوال کا ماتم کیا ہے۔ نطشے نے کہیں لکھا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے مقابلے میں ہماری تہذیب اب بالشتیے پیدا کر رہی ہے۔ اس نے مغربی جمہوریت کا ایسا مضحکہ اڑایا ہے کہ اس کو دیکھ کر لفظ جمہوریت ہی سے آدمی کو چڑ ہو جائے۔ لیکن زوالِ مغرب کا جو ماتم نطشے کے یہاں متن میں تھا، اسپنگلر کے یہاں وہی متن کتاب کا عنوان بن گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا

دن، اس عنوان کے امکانات ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے۔ جدید مغربی تہذیب مر رہی ہے، یہ بات اب ایلون ٹوفلر تک کو معلوم ہے جس کا مغرب کے سماجی ماہرین میں کوئی خاص مقام نہیں۔ گو اس کی پہلی کتاب Future Shock مغرب اور خاص طور پر امریکا میں طویل عرصے تک سب سے زیادہ بکنے والی کتاب رہی ہے اور دنیا کی ۲۰ سے زائد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

البتہ ٹوفلر سے بہت پہلے مغربی تہذیب کے اصل بحران اور اس کی اصل عسرت یا غربت کے عظیم مورخ آرنلڈ ٹوائن بی نے دو حوالوں سے متعین کر دیا تھا۔ ٹوائن بی نے اس حوالے سے کہا ہے: مغربی تہذیب کی موت یقینی ہے، البتہ وہ اگر دو کام کر لے تو اسے بچایا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ اسے کسی نہ کسی طرح کی روحانیت ایجاد کرنی ہوگی اور دوسرے یہ کہ اسے ٹیکنالوجی کے عشق سے جان چھڑانی ہوگی۔

ایلون ٹوفلر بھی تسلیم کرتا ہے کہ جدید مغربی تہذیب کا بحران سائنس اور ٹیکنالوجی نے پیدا کیا ہے، لیکن اس کا کہنا ہے کہ اس کا علاج مذہب کی طرف واپسی نہیں بلکہ یہ بحران سائنس اور ٹیکنالوجی نے پیدا کیا ہے اور وہی اس بحران سے مغرب کو نکال سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ٹوائن بی کے سامنے ٹوفلر بچہ ہے۔ ٹوائن بی جدید مغرب کے عظیم ترین لوگوں میں سے ایک ہے اور اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ روحانیت کے بغیر مغرب کو مرنے سے نہیں بچایا جا سکتا۔

جہاں تک اسلام، اسلامی تہذیب اور مغرب کے باہمی تعلق کا سوال ہے تو صلیبی جنگوں سے اب تک کون سا دور ہے جب مغرب نے اسلام اور اسلامی تہذیب کے خلاف جی بھر کر سازشیں نہیں کیں، ریشہ دوانیوں سے کام نہیں لیا، عالمِ اسلام میں اتھل پتھل نہیں مچائی، اس کے وسائل نہیں لوٹے مگر اس کے باوجود مغرب کا مسلسل تجربہ یہ ہے کہ وہ کبھی بھی اسلام، اسلامی تہذیب اور امتِ مسلمہ کی وحدت کو فنا نہیں کر سکا۔ اسلام کا جلال اور جمال مسلمانوں کو قعرِ مذلت سے نکال لاتا ہے۔ بے شک مغرب بہت طاقت ور اور مادی معنوں میں بہت باثروت ہے، لیکن اگر مغرب صرف سو برسوں تک ان حالات سے دوچار رہے جن سے عالمِ اسلام ایک ہزار سال سے دوچار ہے تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ مغرب کبھی بھی سنبھل نہیں سکے گا اور مغرب کا تجربہ یہ

ہے کہ اس کے سامنے امتِ مسلمہ کے سوا کوئی ملت بھی سنبھل نہیں سکی۔ مغرب نے سب کو منقلب کر کے اپنے جیسا بنا لیا۔ اس میں جاپان، ہندوستان اور چین کسی کی کوئی تخصیص نہیں۔ یہ صرف مسلمان ہیں جو اپنی تہذیب کی مبادیات پر اصرار بھی کر رہے ہیں اور ان میں اپنے تہذیبی اصولوں کی بنیاد پر نئے تہذیبی سانچے تخلیق کرنے کی بھی اہلیت یا کم از کم امکان ہے۔ کیا تاریخ کے وسیع کینوس پر یہ کوئی معمولی بات ہے؟ کیا یہ کسی کو بھی مبہوت کر دینے والا تجربہ نہیں؟ رشک، حسد اور ہیبت۔۔۔ اس سے کچھ بھی پیدا ہو سکتا ہے، لیکن یہ جذبے ملے جلے ہوں تو ان سے غصہ اور ہذیان ٹپکتا نظر آ سکتا ہے۔ وہ غصہ اور وہ ہذیان جو اس وقت جارج بش اور ٹونی بلیئر کیا، پوپ بنی ڈکٹ پر بھی سوار دکھائی دے رہا ہے۔ یہ ایک بہت ہی بڑا احساسِ کمتری ہے جو ایک بہت ہی بڑے احساسِ برتری میں ظاہر ہو رہا ہے۔ بے پناہ مادی طاقت ایک بے پناہ روحانی طاقت کے مقابل ہے اور اسے اپنی وباء کی طرح پھیلی ہوئی روحانی غربت کا احساس ہے۔ تو اب وہ کس طرح کلام کرے؟ اقبال نے کہا تھا:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریائی سے ہے گوہر کی سیرابی

لیکن مسلمانوں کے لیے یہ عمل لاشعوری تھا۔ جارج بش اور اس کے اتحادی اسلام اور مسلمان دشمنی کے ذریعے شعوری طور پر مغرب کی مادی تہذیب کو روحانیت کا انجکشن لگانے کی کوشش کرتے نظر آ رہے ہیں۔ یہ ایک تیر سے دو نہیں کئی شکار کا کھیل ہے۔ اس لیے اس کو پوری طرح سمجھنا آسان نہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس کی مثالیں کہاں ہیں؟

یہ انسانی تاریخ کا ایک انوکھا باب ہے کہ ایک تہذیب نہ صرف یہ کہ ایک ہزار سال کی سازشوں کو جھیل گئی بلکہ اس کے بنیادی اصولوں اور اس کے تہذیبی مظاہر میں اس کے باوجود ایسی کشش باقی رہی کہ وہ دوسری یہاں تک کہ حریف تہذیبوں کے لوگوں کو متاثر کر کے اپنے دائرے میں لا سکی۔

مغرب کے عام لوگوں کا کیا پوپ بنی ڈکٹ کا کہنا ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا۔ لیکن

ایسا ہے تو وہ گزشتہ پچاس سال کے دوران مغرب میں اسلام لانے والے لاکھوں افراد کے عمل کی کیا توجیہ کریں گے؟ کیا یہ لوگ بھی تلوار کے زور پر مسلمان کیے گئے ہیں؟ اہم بات یہ ہے کہ ان لوگوں میں عام افراد ہی نہیں مغربی تہذیب کے بہترین اذہان بھی شامل ہیں جنہیں نہ لالچ میں مبتلا کیا جا سکتا ہے نہ کسی خوف میں۔

انسان کے بارے میں بنیادی بات یہ ہے کہ وہ متاثر اسی چیز سے ہوتا ہے جو اس کے پاس نہ ہو۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مغرب میں مسلمان ہونے والے لوگوں کے لیے نہ تو مغرب جیسی مادی ترقی میں کوئی کشش ہو سکتی تھی اور نہ عیسائیت کی روحانیت اس کے لیے قابلِ توجہ ہو سکتی تھی۔ ہوتی تو یہ لوگ مسلمان ہونے کے بجائے عیسائی ہوتے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ ان لوگوں کو اسلام کی کیا چیز متاثر کر رہی ہے؟

مغرب میں دانشوروں کا جو حلقہ مسلمان ہوا ہے، اس کی تحریریں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے لیے اسلام کا عقیدۂ توحید غیر معمولی کشش کا باعث ہے اور اس کی وجہ صرف روحانیت نہیں بلکہ اس کی وجہ علمی بھی ہے۔ مغربی علوم وفنون کی سیکولر بنیادوں نے وہاں ایک بہت بڑا علمی بحران پیدا کیا ہے اور علوم کی وحدت باقی نہیں رہ سکی۔ انسان اور دنیا کے بارے میں ایک علم کچھ کہتا ہے تو دوسرا کچھ۔ لیکن اسلام کا عقیدۂ توحید نہ صرف یہ کہ پوری زندگی اور کائنات کی توجیہ کر دیتا ہے بلکہ وہ علوم وفنون میں بین العلومی وحدت پیدا کر کے ان کے درمیان درجہ بندی کا نظام بھی پیدا کر دیتا ہے۔

(باقی کل)

اسلامی تہذیب اور مغرب کا احساسِ کمتری (۲)

مغرب کے نسبتاً عام لوگوں کے لیے اصولِ توحید کے روحانی یا علمی پہلو کی نسبت زیادہ کشش اصول توحید کی بنیاد پر وجود میں آنے والے تہذیبی مظہر یعنی خاندان کے ادارے میں ہے۔ یہ وہ ادارہ ہے جس سے مغربی تہذیب بڑی حد تک محروم ہوگئی ہے۔ مغرب میں خاندان ہیں بھی تو ان کی کلاسیکل شکل باقی نہیں رہی۔ کیا یہ تجربہ روحانی عسرت کا تجربہ نہیں؟ اور کیا احساسِ کمتری صرف مادی دائرے میں لاحق ہوسکتا ہے؟

عیسائیت خودکو دنیا کا سب سے بڑا مذہب کہتی ہے۔ حقائق کی روشنی میں اس کا یہ دعویٰ باطل ہے۔ لیکن بالفرضِ محال اسے درست مان بھی لیا جائے تو بھی اس دعوے کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ مغرب کے ترقی یافتہ ترین معاشرے میں عیسائیت کا کوئی مستقبل نہیں۔ سابق مغربی یورپ کی ۷۵ فیصد اور سابق مشرقی یورپ کی ۸۰ فیصد آبادی کسی خدا اور کسی مذہب پر یقین نہیں رکھتی۔ لیکن اسی معاشرے میں جہاں عیسائیت سکڑ رہی ہے، وہیں اسلام پھیل رہا ہے۔

جارج بش نے جب ۱۱ ستمبر کے بعد کروسیڈ کا لفظ استعمال کیا تھا تو جہاں ایک جانب اس نے اسلام اور امتِ مسلمہ کے خلاف صدیوں پرانی نفرت کا اظہار کیا تھا، وہیں اس نے دوسری جانب امریکا اور یورپ کی سیکولر ذہنیت کو عیسائیت کا انجکشن بھی لگانے کی کوشش کی تھی۔ پوپ بنی ڈکٹ کا اسلام اور حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی پر حملہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ وہ ایک جانب اپنے لیکچر میں مغرب کے Godlessness اور Faithlessness کا ذکر کررہا تھا اور دوسری جانب اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی توہین کررہا تھا۔ آخر اس ملغوبے کا اس کے سوا کیا جواز ہوسکتا ہے کہ مغرب کی مردہ مذہبی عصبیت کو اسلام کے حوالے سے تحریک دینے کی کوشش کی جائے۔

امریکا میں حالیہ مہینوں میں کم از کم تین واقعات ایسے ہوئے ہیں جو مغرب کی روحانی غربت اور اسلامی تہذیب کے حوالے سے مغرب کو متحرک کرنے کی کوشش کے ذیل میں آتے

ہیں۔ لبنان کے خلاف اسرائیل کی جارحیت جاری تھی کہ فوکس نیوز پر ایک واقعہ رپورٹ ہوا۔ واقعہ یہ تھا کہ امریکی یہودی نوجوان اسرائیل کی طرف سے حزب اللہ کے خلاف لڑنے کے لیے اسرائیل پہنچا، اسرائیلی رضاکاروں میں شامل ہوا اور مارا گیا۔ فوکس نیوز پر اس کی قربانی کا ذکر ''فخر'' کے ساتھ کیا جارہا تھا اور فخر کرنے والے وہی لوگ تھے جو عالم گیر جہادی تحریک کو صبح شام گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ اصل میں ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی انسان کسی مفاد کے بغیر کسی اور کے لیے جان کی بازی کیسے لگا سکتا ہے۔ وہ اس عمل سے متاثر ہوتے ہیں مگر دیکھتے ہیں کہ ان کے پاس وہ تصور ہی نہیں جوان کے لوگوں میں جہادیوں کی طرح کے لوگ پیدا کر سکے۔ چنانچہ انھیں احساسِ کمتری لاحق ہوتا ہے اور غصہ آتا ہے اور وہ جہاد اور جہادی دونوں کو بدنام کرتے ہیں، مگر انھیں اپنے تہذیبی دائرے میں ایک آدمی بھی ایسا مل جاتا ہے تو وہ اس کو سراہتے ہیں۔

امریکا میں رونما ہونے والا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جارج بش دو ماہ میں ایک سے زائد مرتبہ اپنے معاشرے میں ظاہر ہونے والی نام نہاد ''تیسری بیداری'' یا Third awareness کا ذکر کر چکا ہے اور یہاں بیداری سے مراد مذہبی بیداری کی ایک شکل ہے جس کی امریکا میں اپنی تاریخ ہے۔

تیسرا واقعہ ۱۹ ستمبر کی نشریات میں بی بی سی ورلڈ نے رپورٹ کیا ہے جس کے مطابق امریکی ریاست شمالی ڈکوٹا میں امریکا کے نیوکونز نے اسلامی مدرسے کی طرز پر ایک اسکول قائم کیا ہے جہاں اسکول کی ایک ذمہ دار خاتون کے بقول ایک ایسی نسل تیار کی جائے گی جو Gospe کے تحفظ کے لیے جان کی بازی لگا دینے والی ہو۔ خاتون نے صاف کہا کہ یہ اسی طرز کا تعلیمی ادارہ ہے جیسے مذہبی تعلیمی ادارے پاکستان یا دوسرے اسلامی ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ اسلام اور اس کے تہذیبی مظاہر سے متاثر نہیں، مرعوب ہونے اور ان پر رشک کرنے کی مختلف صورتیں نہیں تو اور کیا ہیں؟

تاریخ کا پورا تجربہ ہمارے سامنے ہے۔ اسلام اور اسلامی تہذیب کی طاقت، اس کے

سارے اسرار اور اس کی ساری کشش اس کے مختلف ہونے میں ہے۔ مجدد الف ثانیؒ سے اقبالؒ، مولانا مودودیؒ اور محمد حسن عسکری تک ہمارے سارے بڑے لوگ وہ ہیں جنہوں نے اسلامی تہذیب کی انفرادیت اور دوسری تہذیبوں سے اس کی عدم مطابقت ثابت کی ہے اور اس پر زور دیا ہے۔ جن لوگوں کا کردار اس کے برعکس ہے، وہ اسلام اور اسلامی تہذیب کے پردے میں مغرب کے آلۂ کاروں کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ مگر اس پوری گفتگو کا لبِ لباب کیا ہے؟ صرف یہ کہ مغرب اسلام اور اس کی زندہ تہذیب کو دیکھتا ہے اور ہولناک احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتا ہے مگر وہ اس کا اعتراف کرنے کے بجائے اپنا احساسِ برتری ظاہر کرتا ہے اور غصے، حقارت اور تذلیل کی زبان میں بات کرتا ہے۔

پردہ۔۔۔مغرب کا نیا اور رنگین موقف

مغرب پردے کا قائل نہیں مگر اس نے پردے پر نئے موقف کا پردہ ڈال دیا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ Black and White کا زمانہ تو ہے نہیں۔اس لیے مغرب کا نیا موقف صرف نیا نہیں ہے۔ مگر مغرب کا پرانا موقف کیا تھا؟

مغربی دنیا نے گزشتہ چالیس پچاس سال کے دوران پردے سے متعلق جو علمِ کلام ایجاد کیا تھا، اس میں مذہبی وسماجی جبر، مردوں کی بالادستی، پسماندگی، تاریک خیالی اور رجعت پسندی جیسی اصطلاحوں کو منتروں کی حیثیت حاصل تھی۔ادھر پردے کا ذکر ہوتا تھا اور ادھر اہلِ مغرب ادم نموشوائے کے مصداق ان اصطلاحوں کا ''جاپ'' شروع کر دیتے تھے۔مگر اب اچانک اہلِ مغرب کے نزدیک پردہ ''نشانِ امتیاز وتفریق'' اور تہذیبی وثقافتی یکجہتی کی راہ میں ''رکاوٹ'' بن گیا ہے۔تجزیہ کیا جائے تو مغرب نے اپنے تئیں پردے کو ''ترقی'' دے دی ہے۔پہلے اس کے لیے تحقیر تھی، اب اس کے لیے ''اعتراض'' ہے۔پردہ ترقی پا کر کس گریڈ میں جا پہنچا ہے، اس کا اندازہ تو مغرب کے ایجنٹوں ہی کو ہو سکتا ہے۔ہمیں تو صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ مغرب نے موقف کیوں بدلا ہے؟

مولانا مودودیؒ نے مغربی تہذیب کو باطل، جاہلیت خالصہ، شجرِ خبیث اور ثمرِ خبیث یونہی نہیں کہا۔مغرب کا اجتماعی شعور کبھی سماجیات اور معاشیات یعنی مادیت سے بلند نہیں ہو سکتا۔ مغرب جب پردے کی تحقیر کرتا تھا تو اس کے سامنے مسلم معاشرے ہوتے تھے۔خود مغرب میں ابتداً جا کر آباد ہونے والے مسلمانوں کی عظیم اکثریت مال کمانے والوں کی تھی۔مغرب کے ساتھ ان کا تعلق یہ تھا کہ وہ مغرب کے لیے ''سستی محنت'' تھے اور مغرب ان کے لیے ان کے آبائی ملکوں سے زیادہ وسائل فراہم کرنے والی دنیا تھی۔پھر ان لوگوں کے ذہن میں یہ بات ہوتی تھی کہ انھیں آج نہیں تو کل اپنے ملکوں میں واپس لوٹ جانا ہے۔چنانچہ ایک جانب Head

Down کرتے رہنا انھیں مناسب حکمتِ عملی لگتا تھا، دوسری جانب وہ اپنے علم واہلیت میں کسی خاص اضافے پر مائل نہیں ہوتے تھے۔ اس سے متصل واردات یہ تھی کہ ان کے ساتھ آجانے والی خواتین یا تو پردہ کرتی ہی نہیں تھیں اور کرتی تھیں تو عام معاشرتی زندگی کے مرکزی دھارے سے دور رہتی تھیں۔ چنانچہ ''تحقیر کا ماڈل'' کافی عرصے مقبول رہا۔ مگر اب اہلِ مغرب کو مسلمانوں کی اس نسل کا سامنا ہے جو اپنے والدین کی طرح ''شرمندگانِ عزیز'' کا کردار ادا کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ یہ اعلیٰ تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل نسل ہے۔ یہ انگریزوں کی طرح انگریزی اور فرانسیسیوں کی طرح فرانسیسی بولتے ہیں۔ پھر یہ نسل پڑھ لکھ کر کچھ کرنا بھی چاہتی ہے۔ اس نسل کی لڑکیوں اور خواتین کے بارے میں یہ کہنا ممکن ہی نہیں کہ یہ اپنے والدین، بھائیوں یا شوہروں کے دباؤ پر پردہ کرتی ہیں۔ وہ اس سلسلے میں خود بھی ابہام پیدا نہیں ہونے دے رہیں، وہ کہہ رہی ہیں: پردہ ہماری مجبوری نہیں، پسند ہے۔ پابندی نہیں، آزادی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان پر تحقیری اور تضحیکی ماڈل مسلط نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ مغرب نے پینترا بدلا ہے اور اس نے چپکے سے اکبرالہ آبادی کے الفاظ میں توپ کی جگہ پروفیسر لا کھڑا کیا ہے۔ چنانچہ جسے دیکھیے برطانیہ، فرانس اور اٹلی میں پروفیسر آف کلچر بنا ہوا ہے۔ یعنی حد ہے ٹونی بلیئر اور جیک اسٹرا جیسے جرائم پیشہ افراد بھی فلسفہ بگھار رہے ہیں۔ اور وہ بھی رنگین۔

اس سلسلے میں جیک اسٹرا نے سب سے زیادہ سنگین بات کہی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اسے نقاب استعمال کرنے والی خواتین سے گفتگو میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی خواتین کے چہرے کے تاثرات نظر نہیں آتے۔ آپ نے دیکھا جیک اسٹرا نے کتنی وزنی دلیل دی۔ آخر وہ برطانیہ کا سابق وزیر خارجہ ہے۔ مگر کوئی جیک اسٹرا سے پوچھے کہ وہ اب تک ریڈیو کیسے سنتا رہا ہے اور ٹیلی فون کیسے استعمال کرتا رہا ہے؟ کیا ان دونوں آلات پر چہرے کے تاثرات چپکے ہوئے ہوتے ہیں؟ تحقیق کی جانی چاہیے کہ جیک اسٹرا اور اس کے ہمنوا انگریزی میں Lack of Imagination، Lack of Hearing اور Lack of Perception کے امراض میں مبتلا تو نہیں؟ لیکن جیک اسٹرا کی یہ دلیل آئی کہاں سے ہے؟ اس کی جڑ کہاں ہے؟ یہ ایک

الگ موضوع ہے اور اس پر ہم کسی اور نشست میں گفتگو کریں گے اور اس سے ہر گز ہر گز تہذیبوں کی عدم مطابقت اور تہذیبوں کا تصادم برآمد نہ ہونے دیں گے۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس کالم میں پہلی سطر سے اب تک ہم نے تہذیبوں کے امتیاز کو سر ابھارنے کا موقع نہیں دیا۔ لیکن خیر چلتے چلتے یہ لطیفہ بھی سن لیجیے کہ چند روز پیشتر برطانوی دار العلوم کا رکن شاہد ملک جیک اسٹرا کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا اور طالبان کی قید سے رہا ہو کر مسلمان ہونے والی ایوان ریڈلے ایک ٹی وی پروگرام میں اس کا مذاق اڑا رہی تھی اور پوچھ رہی تھی کہ آخر یہ کس قسم کے مسلمان اور کس طرح کے کمیونٹی لیڈر ہیں؟ ہماری داستانوں میں ایک پھول شہزادی کا کردار ملتا ہے۔ یہ شہزادی بیٹھے بیٹھے ہنس دیتی ہے اور پھر رونے لگتی ہے۔ مذکورہ لطیفہ کثیر المقاصد ہے۔ یہ کسی کو بھی پھول شہزادی، پھول شہزادہ اور پھول بادشاہ بنا سکتا ہے۔

۲۰ ویں صدی اور ۲۱ ویں صدی کے معجزے

لبنان کے خلاف اسرائیل کی جارحیت اور حزب اللہ کی بے مثال مزاحمت نے اسرائیل سے متعلق کتنی ہی باطل خوش فہمیوں کے پُرخچے اڑا دیے ہیں اور اب تاریخ ان Myths کے ٹکڑوں کو سمیٹتی رہے گی۔

یہ افسانہ نہیں، تاریخی ریکارڈ ہے کہ اسرائیل حزب اللہ کو ایک ہفتے میں ختم کر دینے کا دعویٰ لے کر اٹھا تھا۔ امریکا اور برطانیہ کی اہلیت نے کہا، ٹھیک ہے۔ آگے بڑھو اور جو چاہے کرو۔ اور اسرائیل نے جو چاہا کیا۔ اس نے ایک ہفتہ میں لبنان پر پانچ سو سے زائد حملے کیے۔ ڈھائی ٹن وزنی بم استعمال کیے۔ لیکن ایک ہفتہ اسرائیل کے لیے ایک دن بن گیا اور اب اس کی جارحیت پانچویں ہفتے میں داخل ہوا چاہتی ہے۔ مگر حزب اللہ کی مزاحمتی صلاحیت اسرائیل اور اس کے بدمعاش حامیوں امریکا اور برطانیہ کا منہ چڑا رہی ہے۔

اسرائیل کی طاقت کے Myth تخلیق کرنے میں عرب حکمرانوں اور ان کی نام نہاد پیشہ ور فوجوں کی شرمناک نااہلی کا مرکزی ہاتھ ہے۔ ۱۹۴۸ء کی عرب اسرائیل جنگ جھڑپوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ صرف ایک ہفتے میں ختم ہوگئی اور اسرائیل نے ایک نہیں چار عرب فوجوں کو چوڑیاں پہنا کر بٹھا دیا۔ ۱۹۷۳ء کی جنگ البتہ دو ہفتے چلی اور اس میں دو عرب فوجیں اسرائیل کے مقابل تھیں لیکن اسرائیل نے ان فوجوں کو کاٹھ کباڑ میں ڈھال کر چار آنے کلو چار آنے کلو کی صدا بلند کر دی۔ اس سے یہ Myth تخلیق ہوا کہ اسرائیل ناقابلِ شکست ہے۔ اس کی فوجی مزاحمت کا خیال بھی جنون ہے۔ اسی شعور نے انور سادات کو کیمپ ڈیوڈ جیسے بیہودہ سمجھوتے پر مائل کیا لیکن حزب اللہ کی مزاحمت نے اس Myth کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں۔

اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد کی ساکھ یہ ہے کہ اسے سی آئی اے اور کے جی بی سے زیادہ

موثر سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس کی عالمی موجودگی سی آئی اے کا دو فیصد بھی نہیں۔ لیکن لبنان میں موساد اس بری طرح ناکام ہوئی ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اسرائیل کی انٹیلی جنس کی ناکامی اتنی عیاں ہے کہ اسے کسی پردے کے ذریعے چھپایا نہیں جاسکتا۔ یہ انٹیلی جنس کی ناکامی ہے جس کی وجہ سے اسرائیل حزب اللہ کی قیادت اور اس کے ٹھکانوں کو ختم کرنے میں بری طرح ناکام رہا۔ حالانکہ اسرائیل اس جارحیت میں ہر طرح کے ہتھیار استعمال کر رہا ہے، ان میں کیمیاوی ہتھیار بھی شامل ہیں۔

لبنان میں اسرائیل کی انٹیلی جنس ہی نہیں، اس کی فضائی اور خلائی نگرانی بھی بری طرح ناکام ہوئی ہے۔ اس کے جدید ترین پرندے کے برابر جاسوس جہاز، امریکا اور برطانیہ کے جاسوس سیاروں کی معلومات غرضیکہ کون سی چیز ہے جو لبنان میں ناکام نہیں ہوگئی۔ حالانکہ اسرائیل اور حزب اللہ کی طاقت میں ایک اور ایک لاکھ کی نسبت بھی نہیں ہے۔ تو کیا یہ اپنی طرز کا پہلا موقع ہے؟

حماس اور اسرائیل کی طاقت میں ایک اور ایک لاکھ نہیں، ایک اور دس لاکھ کی نسبت ہے لیکن حماس کے خودکش حملوں نے پورے اسرائیل کو ہلا کر رکھ دیا، حالانکہ آج بھی ان کی مجموعی تعداد ۱۰۰ سے زیادہ نہیں۔ اسرائیل نے حماس کے عام کارکنوں ہی کو نہیں، اس کے بانی شیخ یٰسین اور عبدالعزیز رنتیسی کو بھی شہید کیا۔ اس نقصان کو ''جذب'' کرنا مذاق نہیں تھا۔ لیکن حماس نے اسے جذب کر کے دکھایا اور اخلاقی، نفسیاتی اور جذباتی سطح پر اسرائیل کی سازش کو بھی ناکام بنا دیا۔ یہ بدترین حالات میں ہوش مندی کی بہترین مثال ہے اور اس کے سامنے Passive Resistence کی کوئی مثال نہیں لائی جاسکتی۔ اسرائیل ایک فیصد بھی ان حالات کا شکار ہو جائے تو دو ہفتوں میں تاش کے پتوں کی طرح بکھر کر رہ جائے گا۔

اور عراق میں کیا ہوا؟ دنیا کی دو بڑی بدمعاش ریاستیں امریکا اور برطانیہ اپنے اتحادیوں کے ساتھ عراق پر حملہ آور ہوئیں اور بے شمار مسلمانوں نے عراق پر فاتحہ پڑھ لی۔ لیکن مٹھی بھر مسلمانوں کی مزاحمت نے عراق میں تاریخ کے دھارے کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ حالانکہ عراق کی

نصف سے زائد آبادی آج بھی عملی مزاحمت کے دائرے سے باہر کھڑی ہے۔ امریکا ۷۰ ارب ڈالر سالانہ عراق پر خرچ کر رہا ہے۔ اس کے ۶ ہزار فوجی ہلاک اور ۲۷ ہزار زخمی ہو چکے ہیں۔

اور افغانستان میں کیا ہو رہا ہے؟ امریکا اور ناٹو کی فوجیں اپنی تمام قاہری کے ساتھ موجود ہیں۔ پورا امریکا اور سارا یورپ یہاں موجود ہے اور طالبان کے پاس کیا ہے؟ وہی پرانے زمانے کے ہتھیار جو کبھی سوویت یونین کے خلاف مجاہدین کے ہاتھ میں تھے اور جنہوں نے اس وقت کی سپر پاور سوویت یونین کے پرخچے اڑا دیے۔ لیکن اس وقت کہا گیا تھا کہ امریکا مجاہدین کی مدد کر رہا ہے مگر آج مجاہدین امریکا اور یورپ ہی نہیں، ان کے ناجائز سیاسی بچے اسرائیل کے بھی سامنے کھڑے ہیں۔ ان میں ناموں کا اختلاف ہے۔ لیکن ان کی قوت کا سرچشمہ صرف ایک ہے۔ اسلام اور اس کا تصورِ جہاد اور تصورِ شہادت یہ ۲۰ ویں صدی ہی کے نہیں ہر صدی کے سب سے بڑے ہتھیار ہیں۔ مسلم دنیا کے سیکولر اور نیم سیکولر عربی و غیر عربی، سول اور فوجی ڈکٹیٹر کہیں جا کر ڈوب مریں تو کتنا اچھا ہو۔

حماس اور الفتح۔۔۔ایک تقابل

حماس کی شاندار کامیابی امریکا، یورپ اور اسرائیل سے کیا الفتح سے بھی ہضم نہیں ہورہی۔ جس دن سے حماس ایک بڑی قوت بن کر ابھری ہے، الفتح فلسطین کو خانہ جنگی کی جانب دھکیلنے کے لیے کوشاں ہے، یہ صورتحال حماس اور الفتح کے حوالے سے ایک حیرت انگیز تقابل کو ابھار رہی ہے۔

حماس تحریکِ مزاحمت ہے اور اس کی جڑیں دس سال پہلے بھی عوام میں تھیں۔ اس مرحلے پر یاسر عرفات نے اسرائیل کے ساتھ اوسلو میں نام نہاد امن سمجھوتے پر دستخط کیے اور ایڈورڈ سیلا اور لیلیٰ خالد جیسے ''اولڈ گارڈ'' چیخ پڑے۔ یاسر عرفات غدار ہیں۔ انھوں نے فلسطینیوں کی بے مثال قربانیوں کا سودا کرلیا۔ حماس نے بھی اس نعرے کو پوری شدت سے آگے بڑھایا اور مزید قوت حاصل کی۔ حماس نے یاسر عرفات کو براہِ راست چیلنج کیا، وہ چاہتی تو اس کے پاس اتنی قوت تھی کہ وہ فلسطین کو خانہ جنگی میں مبتلا کر کے یاسر عرفات کا دھڑن تختہ کر دیتی۔ امریکا اور اسرائیل فلسطینیوں کو خانہ جنگی کی آگ میں جھونکنے کے لیے بے تاب تھے۔ مگر حماس نے اس اندیشے کو کبھی حقیقت نہیں بننے دیا۔ اس نے صرف صبر کا نہیں صبرِ جمیل کا مظاہرہ کیا۔ اتنے ہنگامہ خیز ماحول میں ایسا نظم وضبط دنیا نے کم کم ہی دیکھا ہوگا۔ مگر الفتح؟

الفتح حماس کی فتح کے پہلے دن سے شکست خوردہ ذہنیت کا مظاہرہ کررہی ہے، اس کے مسلح افراد آئے دن سرکاری دفاتر پر ہلہ بول دیتے ہیں۔ گلی کوچوں میں مورچے لگا کر بیٹھ جاتے ہیں، اقتصادی حالت کی خرابی پر ہنگامہ کرتے ہیں۔ تنخواہیں طلب کرتے ہیں اور ایک اطلاع یہ ہے کہ فلسطین کے صدر محمود عباس نے حماس کی حکومت کو سبوتاژ کرنے کے حوالے سے معاہدہ کرلیا ہے۔ بیشک خدا جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ مگر الفتح یہ سب کیوں کررہی ہے۔

چالیس سال تک الفتح فلسطین کی واحد نمائندہ جماعت تھی اور اسے رہنمائی کی عادت ہوگئی تھی۔ اب اس عادت میں رخنہ پڑ گیا ہے اور اس کی تکلیف الفتح سے ہضم نہیں ہورہی۔ اصولی اعتبار سے دیکھا جائے تو الفتح کو حماس کے زیرِ تحت کم از کم چالیس سال صبر وسکون سے گزارنے چاہئیں۔ آخر حماس نے بھی تو یہ کام کر کے دکھایا۔ بلاشبہ حماس نے الفتح کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا لیکن اس نے ان کمزوریوں کے حوالے سے فلسطین کے لوگوں سے رجوع کیا۔ الفتح کو چاہیے کہ وہ بھی حماس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے فلسطینی عوام سے رجوع کرے لیکن وہ تو امریکا، یورپ اور اسرائیل سے رجوع کررہی ہے، آخر کیوں؟

کہا جاسکتا ہے کہ یہ الفتح کی قیادت کی کمزوری ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن یہاں اس سے بھی بڑا سبب ہمارے سامنے آکھڑا ہوتا ہے اور یہ سبب ہے الفتح کا لبرل اور سیکولر ذہنی سانچہ۔

پروپیگنڈا تو یہ ہے کہ مذہبی لوگ تنگ نظر اور تھڑدلے ہوتے ہیں۔ ان میں قوتِ برداشت کم ہوتی ہے۔ مخالفت تو ان سے ہضم ہی نہیں ہوتی۔ مگر جو تجربہ ہمارے سامنے ہے اس سے معلوم ہورہا ہے کہ لبرل اور سیکولر تناظر کے حامل لوگ مذہبی لوگوں سے کہیں زیادہ ''کٹر ملا'' ہوتے ہیں اور ان میں برداشت نام کو نہیں ہوتی۔ یہاں اس امر کی نشاندہی ضروری ہے کہ مذہبی لوگوں کی عدم برداشت خواہ غلط ہو یا صحیح ہو عموماً اجتماعی ہوتی ہے۔ وہ اس سلسلے میں اتھارٹی کی سند پیش کرتی ہیں مگر لبرل اور سیکولر ذہنی سانچہ جس عدم برداشت کا مظاہرہ کرتا ہے، وہ انفرادی اور ذاتی ہوتی ہے اور عام طور پر اس کی پشت پر کوئی سند نہیں ہوتی۔ ان کی ذاتی پسند و ناپسند ہی اصل معیار ہوتی ہے۔

اس وقت فلسطین میں یہی ہورہا ہے۔ الفتح اگر حماس کو ایک سال برداشت کر کے اس کی کارکردگی یا ناکارکردگی کے حوالے سے اس پر تنقید کرتی یا اس کے خلاف ماحول پیدا کرتی تو بات سمجھ میں آتی۔ حزبِ اختلاف کی حیثیت سے اسے اس کا پورا پورا حق حاصل تھا لیکن الفتح پہلے دن سے حماس کے تعاقب میں ہے اور یہ عدم برداشت کی انتہا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ الفتح حماس کے خلاف اپنے عوام کے بجائے امریکا اور اسرائیل سے رجوع کررہی ہے۔ یہ صورتحال حماس

اور الفتح کے درمیان ایسے تقابل کو ابھار رہی ہے جس میں حماس کو الفتح پر عددی، جمہوری اور سیاسی برتری ہی نہیں اخلاقی برتری بھی حاصل ہے۔

وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر الفتح کے سامنے حماس کے بجائے کوئی اور اس کی طرح کی جماعت ہوتی تو الفتح کا طرزِ عمل بڑی حد تک مختلف ہوتا۔ اس سے یہ حقیقت نشان زد ہوتی ہے کہ لبرل اور سیکولر ذہنی سانچے کا اصل مسئلہ مذہب ہے۔ مذہب کے سامنے آتے ہی سیکولرازم اپنے مبیّنہ توازن کے ایک ایک پہلو کو خود ہی سبوتاژ کر لیتا ہے۔ پھر اگر اسے لاکھوں لوگوں کو مارنا بھی پڑ جائے تو وہ اس سے نہیں ہچکچاتا بلکہ اس کے لیے جواز جوئی کرتا ہے۔ آخر کار امریکا کی سابق وزیرِ خارجہ سے جب پوچھا گیا کہ عراق میں دس لاکھ عام شہری جن میں پانچ لاکھ بچے بھی شامل ہیں، امریکا اور یورپ کی پابندیوں کی وجہ سے محض دوا اور غذائی قلت سے ہلاک ہو گئے تو انھوں نے بڑی بے نیازی سے فرمایا "It is acceptable and worth it."

واہ اہلِ مغرب

آج کی تازہ خبر، آج کی تازہ خبر، متحدہ عرب امارات کی ایک کمپنی نے امریکا کی پگڑی اچھال دی۔ امریکا کی آزادی پر حملہ کر دیا۔ امریکا کی خودمختاری کو چیلنج کر دیا۔ امریکا کی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا۔ امریکا پر خوف کے بادل چھا گئے۔ اب امریکا کا کیا ہوگا؟ کیا امریکا کو بچایا جاسکتا ہے؟

ظاہر ہے کہ یہ ہمارے خیالات نہیں، امریکا کے ذرائع ابلاغ اور اس کے منتخب ایوانوں سے اٹھنے والا واویلا ہے۔ اخبارات چیخ رہے ہیں۔ ٹی وی چینلز پکار رہے ہیں۔ امریکی سینیٹرز کے منہ سے جھاگ اڑ رہے ہیں۔ کانگریس کے اراکین پر ہیجان طاری ہے۔ ڈیموکریٹس کیا ری پبلکن پارٹی کے لوگ بھی چلاّ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ جارج بش کو بلبلاتے ہوئے کہنا پڑا ہے ''خاموش رہیے! آپ نے اس حوالے سے کوئی بل پیش کیا تو میں اسے ویٹو کردوں گا''۔ لیکن مسئلہ کیا ہے؟

اس کا جواب خود امریکی ذرائع ابلاغ دے رہے ہیں۔ وہ بتا رہے ہیں کہ اس وقت چین، جاپان، سنگاپور اور ڈنمارک کی کئی کمپنیاں امریکی بندرگاہیں چلا رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو کام چین، جاپان، سنگاپور اور ڈنمارک کی کمپنیاں کرسکتی ہیں، وہ متحدہ عرب امارات کی کمپنی کیوں نہیں کرسکتی؟

اس سوال کا جواب واضح ہے۔ متحدہ عرب امارات ایک مسلم ملک ہے۔ گیارہ ستمبر کی واردات میں مبینہ طور پر متحدہ عرب امارات کے دو نوجوان بھی شامل تھے۔ چنانچہ امریکی چیخ رہے ہیں کہ ہمارا سب کچھ خطرے میں پڑ جائے گا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ متحدہ عرب امارات کی کمپنی صرف مال اتارنے اور چڑھانے کی ذمہ دار ہوگی۔ سکیورٹی کے تمام معاملات حسبِ سابق امریکیوں کے ہاتھ میں رہیں گے۔ مگر اس کے باوجود امریکیوں نے چائے کی پیالی میں طوفان اٹھا دیا ہے۔

اس کے برعکس مسلم دنیا کی صورتحال یہ ہے کہ امریکا اور برطانیہ نے صدام حسین کے عراق پر اقتصادی پابندیاں مسلط کیں اور دس سال میں دس لاکھ انسان محض غذا اور دوا کی قلت سے مر گئے۔ ان میں پانچ لاکھ بچے بھی شامل تھے۔ لیکن بی بی سی کے ایک پروگرام میں امریکا کی سابق وزیرِ خارجہ میڈلین البرائٹ نے دس لاکھ لوگوں کی ہلاکت کو ایک فقرے میں اڑا دیا، اس نے کہا:

It is acceptable and Worth it.

امریکا اور برطانیہ گزشتہ تین سال میں مزید ایک لاکھ عام عراقیوں کو قتل کر چکے ہیں۔ عراق کے خلاف ان کی جارحیت کو ململ کا پردہ بھی فراہم نہیں ہو سکا۔ مگر یہ سب کچھ جائز ہے۔ آخر اہلِ مغرب عراق میں جمہوریت کاشت کر رہے ہیں۔ عراقیوں کو تہذیب کا درس دے رہے ہیں۔

امریکا اور پاکستان کا باہمی معاملہ یہ ہے کہ امریکا جب چاہتا ہے، پاکستان پر چڑھ دوڑتا ہے اور پاکستان کا بے حمیت اور بے غیرت حکمران طبقہ اس کی تاویلوں میں لگ جاتا ہے۔

مغربی دنیا پچاس سال سے پورے عالمِ اسلام کو کنٹرول کر رہی ہے۔ ہماری سیاست ان کے ہاتھ میں ہے۔ ہماری معیشت ان کے پیروں تلے ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں، برآمد کرتے ہیں۔ وہ جو چاہتے ہیں، درآمد کرتے ہیں۔ کہیں ہمارے سر پر عالمگیریت کا فلسفہ دے مارا جاتا ہے۔ کہیں ہمیں WTO کے قوانین یاد دلائے جاتے ہیں۔ اور اب تو نجکاری کے نام پر ہمارے سارے ادارے مغرب یا اس کے آلہ کاروں کو فروخت کیے جا رہے ہیں۔ لیکن امریکا کی ایک بندرگاہ کی چند گودیاں امریکا کے ایک ''دوست'' نے ٹھیکے پر لے لی ہیں تو قیامت برپا ہوگئی۔ واہ اہلِ مغرب واہ۔

آخر رُخِ لیلیٰ تھا تماشا تو نہیں تھا!

عراق میں امریکا کی غربت اس درجے کی ہے کہ ابومصعب زرقاوی شہید ہوئے تو امریکی ایک آدمی کی شہادت کی اطلاع پر بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ کسی نے سوکھی روٹی کے ایک ٹکڑے کو پراٹھا باور کرایا۔ کسی نے فائیو اسٹار ڈش اور کسی نے من وسلویٰ۔ بے چارے جارج بش نے تو پریس کانفرنس ہی کرڈالی۔ مگر یہ خوف بھی اسے لاحق تھا کہ زرقاوی کے بعد بھی کچھ نہیں ہوگا چنانچہ اس نے کہا یہ اہم کامیابی ہے مگر آخری کامیابی نہیں۔ دنیا کی واحد سپر پاور اور ''اطلاعاتی فاقوں'' کا یہ حال؟ تین سال کی جارحیت اور کھانے کے لیے لوہے کا ایک آدھ چنا؟

آپ ذرا اخبارات کی فائل اٹھا کر دیکھیں عراق کے خلاف جارحیت کے وقت امریکیوں کے تکبر کا یہ عالم تھا؟ وہ خدا کے لہجے میں کلام کررہے تھے۔ چھ ماہ میں یہ ہوجائے گا۔ ایک سال میں وہ ہوجائے گا اور تین سال میں عراق جنتِ ارضی بن کر ابھر چکا ہوگا۔ وہ مشرقِ وسطیٰ میں جمہوریت کا ماڈل ہوگا۔ لیکن امریکیوں کو چند ماہ میں ہی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگیا۔ مگر وہ اپنی ناکامی کے اعتراف سے گریزاں تھے۔ مگر اب پانی سر سے گزر گیا ہے چنانچہ کسی اور نے نہیں خود امریکا کے محکمۂ جارحیت پینٹا گون نے تسلیم کیا ہے کہ اب تک عراق میں امریکا کے تقریباً پونے تین ہزار فوجی کام آچکے ہیں اور تقریباً ۱۸ ہزار زخمی ہیں اور ان میں اکثریت ان کی ہے جو ''شدید زخمی'' کہلاتے ہیں۔ تین سال میں ۱۸ ہزار زخمی۔ یعنی ہر سال ۶ ہزار زخمی۔ چھ ماہ میں تین ہزار۔ یعنی ہر ماہ پانچ سو زخمی۔ ظاہر ہے ہلاکتیں اس کے سوا ہیں اور شاید ابھی وقت نہیں آیا کہ ہلاکتوں کی صحیح تعداد بتائی جائے ورنہ خود امریکا کے غیر جانبدار حلقے کہہ رہے ہیں کہ مرنے والوں کی تعداد چھ ہزار سے زائد ہے۔ اس طرح جنگ کی نذر ہونے والے امریکیوں کی تعداد ۲۴ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ دنیا کی واحد سپر پاور کا یہ حشر؟

ویتنام کی جنگ میں سوویت یونین اور پوری کمیونسٹ دنیا ویت نامیوں کے ساتھ تھی۔ لیکن

عراق کی تحریکِ مزاحمت کے ساتھ تو کوئی بھی نہیں۔ اس کے باوجود ویت نام میں دس سال کے دوران امریکا کے ۵۵ ہزار فوجی ہلاک ہوئے تھے۔ اس فرق سے ایک اور بہت ہی بڑا فرق ظاہر ہو رہا ہے۔ امریکا ویتنام سے ذلیل ہو کر نکلا مگر اس کی عالمی ساکھ کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا، صرف داخلی سیاسی اتھل پتھل ہو کر رہ گئی مگر عراق اور افغانستان میں امریکا کی ناکامی امریکا کی عالمی ساکھ کو کھا گئی۔ تنہا لڑنے والے نتیجہ بھی بہت بڑا پیدا کر رہے ہیں۔ یہ مزاحمت کی نہاد کا فرق بھی ہے۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ اب ٹیکنالوجی بھی فرق پیدا کر رہی ہے لیکن یہ غلط بحث ہے۔ اصل چیز ہتھیار نہیں، ہتھیار استعمال کرنے والے کا جذبہ اور اس کا مقصد ہوتا ہے۔ صرف آزادی کے دفاع اور جہاد میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ عزیز حامد مدنی کا ایک شعر ہے:

مجنوں کے سوا کس سے اٹھی منّتِ دیدار
آخر رُخِ لیلیٰ تھا تماشا تو نہیں تھا

معلوم ہوا کہ ہدف مختلف ہو تو جان دینے کا اسلوب بھی بدل جاتا ہے اور جان دینے کے اسلوب سے اور بہت کچھ تبدیل ہوتا ہے، بقول شاعر:

فرہاد کو پڑا تھا محبت سے ایک کام
مجنوں لگا ہوا تھا محبت کے کام پر

البتہ امریکا کی خوش بختی اس کے باوجود دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے جس قوت کو اپنے ملک سے ہمنوا فراہم نہیں ہو رہے، اسے مسلم دنیا میں بے شمار وکیل دستیاب ہیں۔ یہ وکیل آپ کو اور مجھے ورغلا رہے ہیں۔ دیکھو جارج بش خود امریکا میں کتنا غیر مقبول ہو گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ امریکا اور جارج بش دو الگ چیزیں ہیں مگر حضور جب جارج بش عراق پر جارحیت کر رہا تھا تو ۷۰ فیصد امریکی اس کے ساتھ تھے، اب وہ اس کے ساتھ نہیں تو اس لیے کہ جارج بش کامیاب نہیں ہو سکا اور یہ لوگ انسانوں کی اس قسم سے ہیں جو ناکامی میں شریک نہیں۔

Limbo

آج ہم Limbo پر گفتگو کریں گے۔آپ پوچھ سکتے ہیں کہ یہ کسی اطالوی یا فرانسیسی کھانے کا نام ہے؟ جی نہیں تو کیا یہ ہالی ووڈ کی کسی آنے والی فلم کا عنوان ہے؟ ہرگز نہیں۔تو پھر ایک اردو کالم کا انگریزی نام رکھنے کا مطلب؟ بات سیدھی سی ہے۔اگر ہم لفظ کو اردو میں لکھتے تو زیر، زبر اور پیش کے فرق سے اس کا تلفظ بدل جاتا۔مگر یہ لفظ کیا ہے اور اس کے معنی کیا ہیں؟ اور Limbo پر گفتگو کر کے ایک اور کالم ضائع کیوں کرنا چاہتے ہیں۔

اصل میں قصہ یہ ہے کہ گزشتہ ہفتے کیتھولک عیسائیوں کے روحانی مرکز ویٹی کن میں کیتھولک فرقے کے ماہرین علم کلام کا ایک خصوصی اجلاس ہوا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ Limbo پر گفتگو کی جائے اور کسی حتمی نتیجے تک پہنچا جائے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ کیتھولک چرچ بالآخر ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ یہ بلاشبہ کیتھولک چرچ کی ۸۰۰ سالہ تاریخ کے اہم واقعات میں سے ایک واقعہ ہے۔مگر سوال ہے کہ Limbo ہے کیا؟ اس سے قبل کہ آپ انگریزی کی کوئی لغت کھولیں اور گمراہ ہوں عرض یہ ہے کہ Limbo عیسائیت کی تاریخ کا ایک تصور تھا جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ وہ بچے جو بپتسمہ سے قبل اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں، وہ مرنے کے بعد کہاں جاتے ہیں، جنت میں یا دوزخ میں یا کہیں اور؟

اس سلسلے میں کیتھولک چرچ کا تصور یہ تھا کہ وہ نہ جنت میں جاتے ہیں نہ دوزخ میں بلکہ وہ Limbo میں چلے جاتے ہیں۔ اسلامی فکریات سے اس لفظ اور اس میں مضمر تصور کے مساوی اصطلاح تلاش کی جائے تو وہ ہے ''اعراف''۔ کیتھولک چرچ اگرچہ اب اس کو ''عقیدہ'' ماننے کے لیے تیار نہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم نے اب تک اس کے لیے تصور اور اصطلاح جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کیتھولک چرچ کی تھیالوجی میں موجود ایک عقیدہ ہی تھا جسے مذکورہ خصوصی اجلاس میں رد کر دیا گیا۔لیکن کہا یہ جا رہا ہے کہ نہیں یہ عقیدہ نہیں تھا محض ایک

تصور تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ جس تصور کو کم و بیش ایک ہزار سال سے بسر کیا جا رہا ہو، اسے تصور کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے؟ خیر یہ عیسائیت کے قلب سے ہو یا عیسائی علمِ کلام کے حاشیے پر پڑا ہوا کوئی خیال ہو کیتھولک چرچ نے اس سے رجوع کر لیا ہے اور اب کیتھولک چرچ بپتسمہ سے قبل مرنے والے بچوں کو Limbo میں نہیں بھیجے گا تو پھر گزشتہ ہفتے سے ایسے بچے کہاں جایا کریں گے؟ کیتھولک چرچ نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ایسے بچوں کو سیدھا جنت میں بھیجا جائے گا۔ مطلب یہ کہ ایسے بچوں کے بارے میں اب چرچ کا سرکاری موقف یہ ہوگا کہ یہ بچے جنت میں چلے جاتے ہیں۔ بہترین۔۔۔ لیکن کیتھولک چرچ نے یہ فیصلہ کس بنیاد پر کیا؟ اور پہلے موقف کی بنیاد کیا تھی؟ عیسائیت کے حوالے سے ایسے سوالات اٹھانا فضول ہے۔ عیسائیت کی تاریخ میں اتنی افراط و تفریط ہے کہ اسے دیکھ کر اچھے اچھوں کو پسینے آ جائیں۔ عیسائیت کی تاریخ میں بائبل کے نسخے تک تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ ہزار سال پہلے کی بائبل اور ہے اور پانچ سو سال پہلے کی بائبل اور۔ کیتھولک چرچ جس بائبل کا قائل رہا ہے، مارٹن لیوتھر کی فکر کے حامل لوگوں کا چرچ اس کے بڑے حصے کو بائبل سے نکال باہر کرتا ہے۔ بائبل کے پرانے نسخوں میں حضرت عیسیٰ کے لیے Begotten son کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے جس سے زیادہ توہین آمیز اصطلاح حضرت عیسیٰ اور خود خداوند قدوس کے لیے کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہم نے دیکھا تو نہیں سنا ہے کہ اب بائبل سے Begotten کا لفظ خارج کر دیا گیا ہے۔ تو اب اگر کیتھولک چرچ نے Limbo کے تصور پر کرم فرمایا ہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ مگر اس کی سند کوئی نہیں۔ یقیناً اس لفظ کے پہلے تصور کی بھی کوئی بنیاد نہیں تھی۔ ہوتی تو بتایا جاتا کہ وہ کیا ہے۔ مطلب یہ کہ اتنا بڑا مذہب اور ''قیاسِ محض'' سے چلایا جا رہا ہے۔ لیکن یہ تو محض اس اطلاع کا ایک تناظر ہے۔ اس کا ایک اور تناظر اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ہے۔ کیا خیال ہے یہاں سے بھی تہذیبوں کا تصادم نکال لیا جائے؟ ہمیں تو ویسے بھی اس کا ''شوق'' ہے۔

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں، ہمیں تو صرف اتنا معلوم ہے کہ یورپ میں عیسائیت کا کوئی حال ہے نہ کوئی مستقبل۔ جس خطے کو مغربی یورپ کہا جاتا ہے، برطانیہ کے ممتاز جریدے The

Economist کے ایک سروے کے مطابق وہاں کی ۷۵ فیصد آبادی عیسائیت پر ایمان ہی نہیں رکھتی اور جس خطے کو آپ مشرقی یورپ کہتے ہیں، وہاں کم وبیش ۷۸ فیصد لوگ عیسائیت پر یقین نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ پوپ بینی ڈکٹ شش دہم گزشتہ دنوں جرمنی گیا تو جہاں اس نے اپنے بدنامِ زمانہ لیکچر میں اسلام اور حضورِ اکرمؐ کی توہین کی، وہیں یورپ کے Godless معاشرے کا ماتم بھی کیا۔ البتہ ایشیا اور افریقہ اپنی غربت کی وجہ سے عیسائیت کے لیے زرخیز زمین ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جب عیسائیت ایشیا اور افریقہ میں آتی ہے تو یہاں اس کا مقابلہ اسلام سے ہوتا ہے اور اسلام میں معصوم بچوں کے لیے کوئی Limbo نہیں ہے۔ احادیثِ مبارک سے صاف ہدایت ملتی ہے کہ معصوم بچے سیدھے جنت میں جاتے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ یہ بچے اللہ تعالیٰ سے اصرار کریں گے کہ وہ اپنے والدین کے بغیر جنت میں نہ جائیں گے۔ اب عیسائیت ایسے دین کے مقابلے پر Limbo پیش کرے گی تو اسے بڑی مشکل پیش آئے گی، اس کی وجہ ظاہر ہے۔

آپ بڑے لوگوں کے بارے میں مبہم گفتگو کریں تو اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا لیکن جن والدین کے معصوم بچے اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں، ان سے آپ کہیں کہ صاحب کہہ نہیں سکتے کہ وہ مرنے کے بعد کہاں گئے ہوں گے، جنت میں یا دوزخ میں یا کہیں اور تو بے چارے والدین جب تک زندہ رہیں گے، ایک نفسیاتی الجھن اور جذباتی خلش ان کے ساتھ رہے گی۔ پھر ایشیا اور افریقہ میں تو ماشاء اللہ بچے بھی بہت ہوتے ہیں اور کم عمری میں دنیا سے رخصت ہو جانے والے بچوں کی شرح بھی بہت بلند ہے چنانچہ عیسائیت کا Limbo خود عیسائیت کو ایشیا اور افریقہ میں Limbo کا شکار کرسکتا ہے چنانچہ کیتھولک چرچ نے Limbo سے جان چھڑانے ہی میں عافیت سمجھی تو معاف کیجیے گا کہ تہذیبوں کا تصادم اس کو کہتے ہیں اور چوں کہ مغرب اس تناظر کو پوری طرح سمجھتا ہے چنانچہ وہ تیاری بھی ویسی ہی کرتا ہے اور کر رہا ہے۔